SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - III

بی۔ اے ۔ سال سوم

SEMESTER - V

PAPER NO. VII

SPECIAL STUDY OF PROSE : SIR SYED AHMED KHAN

سرسید احمد خان

Dr. Sajid Ali Qadri

Head Of Department, Urdu

S.P.D.M. College, Shripur. Dhule

مصنف :۔ ڈاکٹر ساجد علی قادری

(صدر شعبہء اردو)

ایس۔پی۔ڈی۔ایم۔کالج، شرپور۔ضلع دھولیہ

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - III

بی۔ اے ۔ سال سوم

SEMESTER - V

PAPER NO. VII

SPECIAL STUDY OF PROSE : SIR SAYYED AHMAD KHAN

سرسید احمد خان

Dr. Sajid Ali Qadri

Head Of Department, Urdu

S.P.D.M. College, Shirpur. Dist. Dhule

مصنف :۔ ڈاکٹر ساجد علی قادری

(صدر شعبہء اردو)

ایس ۔پی۔ڈی۔ ایم۔ کالج ، شیرپور ضلع دھولیہ

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

(B.A. Part-III Urdu- Paper-VII & XII)

VII. DSE-E31.Spl Studies of prose &Poetry(Sir Sayyad Ahmed Khan
Xll DSE-E156.Dr.Allama Iqbal

Author's/Editor's name:

Dr. Sayyad Sabiha Sameeroddin

Dr. Sajid Ali Qadri

Published by:

Dr. V. N. Shinde
Registrar
Shivaji University, Kolhapur-416 004

Printer's Details:

Shri. B. P. Patil
Superintendent
Shivaji University Press, Kolhapur-416 004

Edition-1st

ISBN:978-93-92887-74-1

CENTRE FOR DISTANCE EDUCATION

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

Copyright ©Registrar, Shivaji University, Kolhapur. (Maharashtra)

بی۔ اے۔ سال دوّم (سمیسٹر سوّم)

TAREEKH-E-URDU ZABAN-O-ADAB

فہرست
برائے نصاب

سرسید احمد خان

Page No.	CHAPTER	ابواب	نمبر شمار
4	**Sir Sayed Ahmad Khan Aur Onka Ahed**	سرسید احمد خان اور ان کا عہد	1
18	**Sir Sayyed Ahmad Khan Ki Elmi O Adbi Khidmat**	سرسید احمد خان کی علمی و وطنی خدمات	2
42	Sir Sayyed Ahmad Khan Bahesiyat Muarrikh O Safi	سرسید احمد خان بحیثیت مورخ اور صحافی.	3
57	**Sir Sayyed Tahrik Aur Urdu Adab**	سرسید تحریک اور اردو ادب	4

باب : اول

سرسید احمد خان اوران کا عہد

اکائی اجزاء

1.1 مقاصد

1.2 تمہید

1.3 موضوع کی وضاحت

1.3.1 سرسید احمد خان کے حالات زندگی

1.3.2 تعلیم

1.3.3 ازدواجی زندگی

1.3.4 شخصیت ومزاج

1.3.5 ملازمت

1.3.6 وفات

1.4 سرسید احمد خان کا عہد: سیاسی وسماجی پس منظر

1.5 خلاصہ

1.6 نمونے کے امتحانی سوالات

1.7 فرہنگ

1.8 شفارش کردہ کتابیں:

1.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔

☆ سرسیداحمدخان کی ادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ سرسیداحمدخان کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ سرسیداحمدخان کے عہد معاشی وسیاسی حالات سے واقف ہوسکیں گے۔

1.2 : تمہید

برصغیر کی تاریخ میں انیسویں صدی کا عہد بے حد خاص اور معتبر ہے۔اس صدی نے ہندوستان کی سرزمین کو ایک ایسی ہستی سے روبرو کروایا ہے جس کی علمی وادبی ثقافتی ومذہبی،فلسفی وصحافتی خدمات نے ادب اور تاریخ دونوں میں حیاتِ جاوید کردیا ہے۔عبقری شخصیت سرسیداحمدخان ہے۔سرسیداحمدخان صرف ایک عظیم مدبر اور مصلح قوم ہی نہیں تھے بلکہ انکی شخصیت کے کئی مقناطیسی پہلو ہے۔انہوں نے جس میدان میں قدم رکھا اپنی تحریروں،تقریروں اور طرزعمل سے اس میں ان گنت نقوش مرتب کیے ہیں وہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے سچے خواہ تھے۔ان کا یہ نظریہ بقول عام رہا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں اور برطانوی حکومت کے درمیان جو غلط فہمی یا دوریا پیدا ہوگئی ہے اس دوری کا براہِ راست ذمہ سماجی واقتصادی اور تعلیمی میدانوں میں مسلمانوں کی پس ماندگی رہی ہے۔اس نااتفاقی کو ختم کرنے کے لیے سرسید احمد خان نے کئی تعلیمی تحریک جلسے منعقد کیے۔تاکہ انگریزوں کے دلوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہونے والے شکوک دور ہوجائیں۔اس سلسلے میں سرسیداحمدخان نے جواں مردی کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔انہوں نے بڑی بے باکی سے انگریزوں کی غلطیوں کو واضح کیا اور یہ احساس دلایا کہ ہندوستانی مسلمان بھی انگریزوں کے تعلیمی پالیسی کے ہمنوا ہے۔اپنے اس نظریات وخیالات کی تبلیغ کے لیے سرسید احمدخان نے صحافت کا بھی سہارا لیا۔اس سلسلہ میں سائنٹی فک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان علوم وفنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے۔ایسی زبان میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں سرسیداحمدخان نے ہندوستان میں تعلیم کو نئی شکل عطا کی تھی۔جدید تعلیم کے محرک اور جدید نثر کے بانی سرسیداحمدخان نے صرف طرز تحریر ہی نہیں کیا بلکہ ہندوستانیوں کے طرز اساس کو بھی بدلا ہے۔انہوں نے سائنسی معروضی اور منطقی طرز فکر کو بھی فروغ دیا

تھا۔عقلیت کی بنیاد مضبوط کیں۔انکی تحریک نے شاعروں اورنثر نگاروں کی ایک بڑی تعداد کومتاثر کیا۔سرسید کا شمار ہندوستان کی عظیم ریفامروس میں ہوتا ہے۔انکی جدید تعلیمی پالیسی نے ڈوبتی قوم اور بے سمت معاشرے کوراہِ راست پرلانے کی کامیاب سعی کی ہے۔وہ محسنِ برصغیر تھے۔لیکن انکا سیاسی واقتصادی وسماجی عہد بے حدانتشاراورخلفشار سے پُر تھا۔تا کہ فن تاریخ کوایک بنیادفراہم کی جاسکے۔جس سے آنے والی نسلیں فائدہ اُٹھاسکیں۔کیونکہ فن تاریخ، مورخین کوقوم/معاشرہ کی تاریخ میں ہونے والی تبدیلیوں اورتسلسل کے عناصر کے متعلق صحیح ادراک وفہم فراہم کرتا ہے۔''

۱۸۵۷ء کی خونیں انقلاب کے بعد ہندوستان کی سیاسی واقتصادی زندگی بے حدخستہ حال ہوچکی تھی۔ایسے پر آشوب فضاء میں سرسیداحمدخان نے قوم وسماج کے لیےفلاح وبہبود کے کام کوبڑی ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے رہے تھے۔سرسیداحمدخان ایک ہمہ گیرشخصیت کے مالک تھے۔ان کے کارناموں کی داستان کو چندصفحات میں قید نہیں کیاجاسکتا ہے۔اس باب میں سرسیداحمدخان کی حالاتِ زندگی اورانکا عہد پرتفصیل سے گفتگو کی جائیں گی۔

1.3 : موضوع کی وضاحت

1.3.1 : سرسیداحمدخان کی حالات زندگی

سرسیداحمدخان ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء میں اپنے نانا خواجہ فرید کی حویلی واقع دلی میں پیداہوئے تھے۔ان کے والد کا نام میرمتقی تھا۔سرسیداحمدخان کے آباواجداد وشاہ جہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔یہ خاندانِ حضرت شاہ غلام علی سے بیعت تھا۔اورخودشاہ صاحب جی میرتقی کوعزیز رکھتے تھے۔خواجہ فریدالدین سرسید کے نانا تھے۔جنہیں مغلیہ دربار سے ''دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمدخان بہادر مصلح جنگ کا خطاب ملا تھا۔ان کے دادا سید ہادی بھی مغلیہ دربار کے خطاب یافتہ تھے۔عزیزالدین عالمگیرثانی نے ۱۱۶۸ء میں انہیں ''جواد علی خان اورمنصب ہزاری ذات پانصدسواردواسپہ'' کے خطاب سےنوازا تھا۔سرسیداحمدخان کوان دونوں خاندانوں کی خوبیاں اورصلاحیتیں ورثے میں ملی تھیں۔سرسید کی والدہ عزیزالنساءبیگم نے اپنے بچے کی تربیت اپنے خاندانی مزاج کے مطابق کی تھی اوراپنے بیٹے کی صلاحیتوں کوابھارنے کی پوری کوشش کی تھی۔تعلیم کووہ خاص اہمیت دیتی تھیں اورروزسیداحمد کا سبق سنتیں اورنئے سبق کی تیاری کراتیں۔''گلستان سعدی'' انھوں نے اپنی والدہ ہی سے پڑھی تھی۔سرسیداپنی والدہ کی شخصیت سے بے حدمتاثر تھے۔اس کا اعتراف انہوں نے خودکیا۔

''میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق دانشمند اور دور اندیش فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اس نے تربیت کی ہو کیا اثر پڑتا ہے۔''

(سرسید احمد خان'' سیرۃ فریدیہ'' مطبع سفید عام آگرہ۔۱۸۹۲۔ص ۵۳۔۵۴)''

1.3.2 : تعلیم

سرسید احمد خان کی تعلیم کا آغاز روایتی انداز میں ہوا تھا۔شاہ غلام علی نے بسم اللہ پڑھائی اور ایک استانی سے ناظرہ قرآن پڑھا۔ پھر مولوی حمید الدین سے آمد نامہ، خالقِ باری اور گلستان و بوستان کا درس لیا۔عربی میں شرح ملا ۔شرح تہذیب اور مختصر معانی پڑھیں۔انکی طبیعت ابتداء سے ہی کسی ایک کتاب یا موضوع پر قناعت کرنے والی نہ تھی۔چنانچہ انہوں نے علمِ طب اور علم ریاضی کی طرف بھی توجہ کی۔حکیم حیدر خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں۔لیکن علم کی پیاس ان کی ان قطروں سے نہیں بجھ سکی۔اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔اردو ادب سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی۔جب دلی میں ذوق غالب،صہبائی،آزردہ،شاہ نصیر،مومن اور شیفتہ کی شاعری کا چرچا تھا۔سید احمد نے بھی ان مشاہیر سے کسب فیض کیا۔ماحول کے اثر سے خود بھی شعر کہنے لگے اور آہیؔ تخلص کرتے تھے۔

1.3.3: ازدواجی زندگی

سرسید احمد خان کی شادی ۱۹/ برس کی عمر ہوئی تھی۔ان کی شادی ۱۸۳۶ء میں نقیب املا ولیا خاندان کی بیٹی پاکیزہ بیگم عرف مبارک بیگم سے کردی گئی۔جو نہ صرف یہ کہ ایک معزز و علم پرور گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں بلکہ خود بھی پڑھی لکھی تھیں۔چنانچہ تاحیات وہ کبھی اپنے شوہر کے علمی اور اصلاحی کاموں میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔بلکہ ہمہ وقت سمجھداری سے برابر معاونت اور رفاقت کا حق ادا کیا۔خوش طبعی کے ساتھ ساتھ سید احمد خان کا فطری میلان سنجیدگی کی طرف تھا اور ایسے اسباب بھی پیدا ہوتے چلے گئے جنکی وجہ سے ان کا طرز زندگی یکسر بدل گیا۔انکی بیوی کا انتقال ۱۸۶۱ء میں مرادآباد میں ہوا تھا۔اس وقت سرسید احمد کی عمر چوالیس سال تھی۔احباب نے نکاح ثانی پر اصرار کیا۔لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ

''محمود کی ماں کہاں سے آوے گی وہ تو قوم سے منسلک تھے اور خدمت کے جذبہ سے سرشار اور خود

بچوں کی نگرانی اور پرورش بڑی محنت اور ذمہ داری سے کی۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، نامی پریس، کانپور۔۱۹۰۱ء۔ص ۴۸۸)

1.3.4 : شخصیت ومزاج

سرسید احمد خان ان عظیم ہستیوں میں سے ایک اور منفرد ہیں جنکی ذات میں صدیوں کے دامن پر پھیلے ہوئے رجحانات ایک مرکز پر آ کر نیا موڑ لیتے ہیں۔اور اسی لیے یہ ہستی ایک زمانے یا کسی ایک دور کی نمائندہ ترجمان ہی نہیں ہوتی بلکہ ساری تاریخ اور تمام روایت کی نمائندگی کرتی ہے۔

سرسید نیک نیت، سچے انسان اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔دنیا کے زیادہ تر لوگ ڈھل مل یقین ہوتے ہیں یا پھر کسی نفسیاتی برائی کو اپنے اندر پختہ کر کے اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔سرسید اپنے خاندان کے اثر سے ان دونوں دائروں سے الگ رہ کر سیدھی راہ پر چلتے ہیں۔دیانت داری کی راہ انھوں نے کبھی نہیں چھوڑی۔

وہ پیدائشی ذہین انسان تھے۔عام طور پر ایمان دار لوگوں کا ذہین ہونا لازمی نہیں ہوتا اور ذہانت زیادہ تر لوگوں کو ایمان داری سے ہٹا کر مفاد پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔سرسید کے ساتھ ایسا نہیں ہوا کیوں کہ ایمانداری کی صفت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی اور مستحکم تھی۔ایسی ذہانت نے ان کے اندر تحقیق اور جدید علوم حاصل کرنے کا مادہ پیدا کیا۔انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز تحقیقی تقبضوں سے کیا۔اس کی خوبصورت مثال ''آثارالصنادید'' ہے۔انکی ذات میں ذہانت، کردار کا وہ امتزاج ملتا ہے جو کہیں صدیوں میں جا کر کسی ایک انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

وہ واقعیت پسند (Realist) تھے۔یہی سبب ہے کہ ان کا کردار بھی فعال و باعمل تھا۔وہ حالات و واقعات سے فرار اختیار نہیں کرتے تھے۔قوم کی بھلائی۔اس کی فلاح وترقی کا مقصد ہمیشہ ان کے سامنے رہا۔اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کئی قربانی دیں۔دراصل سرسید احمد خان کی پوری زندگی ایک مثال ہے۔سرسید ایک ایسے کردار کا نام ہے جو اندھیرے کو روشنی میں بدلتا ہے۔اپنی اس دیانت داری کے سبب کئی مشکلات کا سامنا بھی کیا ہے۔دوست کے دشمن بن گئے۔انکی ادبی وعلمی واصلاحی کاموں پر کئی اعتراضات ہوئے۔لیکن انہوں نے قوم کی بھلائی کے لیے جو بہتر سمجھا وہی کیا۔دراصل سرسید راست باز انسان تھے۔انہوں نے اپنی راست بازی اور اپنی طبیعت وجبلت کے باعث دنیا کو مخالف بنالیا تھا۔لیکن سچ کا راستہ کبھی نہیں چھوڑا۔

سرسید مصلح قوم تھے۔اپنی قوم کے ہر فعل اور ہر شعبۂ زندگی میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اس میں

اصلاح کا پہلو موجود تھا۔ اسی راستے سے انھوں نے تبدیلی کے عمل کا اُبھارا اور اپنی قوت عمل سے اسے عام کیا۔ قوم ان کی تحریریں اور انکے عمل کو دیکھ کر مخالف ہوئی اور انہیں ''پیر پیمبریا'' کا خطاب دے کر لعن طعن کی بارش کی۔ لیکن وہ انہیں اسی حالت میں سمجھاتے رہے کہ وہ ہی دراصل ان کے دوست ہیں۔ بہر حال آج انکی شخصیت کو دیکھئے تو وہ ہندوستان کے انگریزی دور میں نشاۃ الثانیہ کے بانی ٹھہرتے ہیں۔ نئی روشنی جواب تک دبی دبی سی آرہی تھی ان کے فکر و عمل کے ساتھ تیز ہوجاتی ہے۔ اس روشنی کو ایک مرکز پر لا کر عام کرنے والے سرسید احمد خان ہی ہیں۔

انکی تحریروں کا آج مطالعہ کیجیے تو وہ نئی روش کے حامی اور پرانے طاعون زدہ رسم و رواج کے دشمن نظر آتے ہیں۔ یہی نئی روشنی ان کی شخصیت کا اصل روپ ہے۔ وہ ضروری پرانی روش کو ترک نہیں کرتے بلکہ اسے نئی روشنی میں رکھ کر دکھاتے ہیں۔ مثلاً وہ اسلام کو ترک نہیں کرتے بلکہ نئی روشنی کی شعاعیں ڈال کر یہ دکھاتے ہیں کہ اسلام سے کتنی آرائشیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ جنھوں نے اسلام کی روح کو مسخ کر دیا ہے اور اس طرح بھی وہ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا باعث ہوتے ہیں۔ ان سے متاثر ہونے والے دوسرے دانشور جیسے حالی، شبلی، نذیر احمد، امیر علی، محسن الملک چراغ علی وغیرہ اپنے اپنے ور پر ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کر کے ان میں شعور کا چراغ روشن کرتے ہیں۔ سرسید نے روشن ضمیر کے جس چراغ کو روشن کا تھا اس سے آج تک چراغ سے چراغ جلتا چلا آرہا ہے۔

1.3.5 : ملازمت

سرسید احمد خان ۲۱ سال عمر کے تھے ان کے والد کا ۱۸۳۸ء میں انتقال ہوگیا تھا۔ سیاسی حالات کے بدلتے مزاج کے مطابق سرسید احمد خان مغلیہ دربار سے وابستہ ہونے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو قبول کیا۔ دلی ۱۸۰۱ء سے ہی انگریز عمل آری میں شامل ہوچکی تھی۔ لہٰذا سرسید احمد خان کی پہلی سرکاری ملازمت کا سلسلہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے شروع ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے خالو صدر امین خلیل اللہ خان کی اعانت سے دہلی کی کسمپرسی میں کام سیکھا۔ اور جلد ہی منصبی معاملات سے خاصی واقفیت بھی حاصل کر لی۔ ۱۸۳۹ء میں آگرہ میں نائب منشی کے عہدے پر تقرر ہوا تھا۔ سرسید احمد خان صرف کسب معاش پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ دوسرے اشغال بھی انکی توجہ کا مرکز رہے اور کوئی نہ کوئی اعلیٰ خیال یا مشغلہ ان کی زندگی کا مقصد بنا رہا تھا۔ جن دنوں وہ آگرے میں نائب منشی کے منصب پر فائز تھے اسی زمانے میں عہدہ منصفی کے لیے امتحان شروع کر دیے تھے۔ پہلی بار اس امتحان میں کوشش کی اور کامیابی حاصل کی۔ ۲۴/دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری میں ان کا تقرر بحیثیت منصف ہوا۔ پھر ۱۰/جنوری ۱۸۴۲ء کو تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آ گئے۔ جہاں انھوں

نے پہلا مذہبی رسالہ ''جلاء القلوب مذکرالجبوب'' ۱۸۴۳ء میں طبع کیا۔فروری ۱۸۴۶ء میں تبدیل ہوکر دلی پہنچے اور ۱۸۵۶ تک وہیں ان کا قیام رہا۔سرسیداحمدخان نے دہلی کے دورانِ قیام متعدد رسالے لکھے جوانکی علمیت کی گہرائی کا ثبوت ہے۔دلی میں صدرامین کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔اس کے بعد بجنور میں اسی عہدے پر فائز رہے۔جبکہ مرادآباد میں صدرالصدور کی حیثیت سےتعیناتی ہوئی تھی۔سرسیداحمدخان اپنی ایمانداری اورذہانت کی بناء پر ملازمت میں ترق کی سیڑھی ہمیشہ چڑھتے رہے تھے۔غازی پور سے ترقی پاکر بنارس میں مامور ہوئے تھے۔ان علاقوں میں جن خدمات کی وجہ سے بہت مقبول رہے۔جس کا اعتراف برطانوی حکومت نے بھی کیا ہے۔۱۸۸۸ء میں ''سر'' کا خطاب سےنوازا گیا۔

1.3.6 : وفات

سرسیداحمدخان انتقال سے انیس روزقبل سیدمحمود کے مکان سے حاجی اسماعیل خان رئیس رتلوی کی کوٹھی میں منتقل ہوگئے وہیں۔۲۴ مارچ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور۲/ مارچ ۱۸۹۸ء بروز اتوار (یکشنبہ) دس بجے شب رحلت کی۔محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین اپریل ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۲۳ پرتفصیلات مندرج ہیں کہ ۲۸/ مارچ ساڑھے پانچ بجے شام جنارہ اٹھا جولوگ شریک تھے ان میں سیدمحمود۔ٹرسٹیوں میں نواب مہدی علی (ممبئ) حاجی اسماعیل خاں۔ مولوی زین العابدین،مولوی ذکاءاللہ دہلوی،خواجہ الطاف حسین حالی،مرزا عابدہ علی بیگ (حیدرآباد) حبیب الرحمٰن خان شیروانی،رئیس بھیکم پورم،کلکٹر جج اوردیگرافسران ضلع بھی موجود تھے۔کالج کےطلباء،اساتذہ اورشہر کےامیروغریب سب ہی افراد نے کرکٹ لان پرنمازِ جنازہ ادا کی۔امامت مولوی عبداللہ انصاری نے کی۔پھر یونیورسٹی کی مسجد میں تدفین ہوئی اوروہیں ۳۰/ مارچ کوسوئم ہوا۔سرسیداحمدخان کی موت کسی ایک شخص کی موت نہیں بلکہ ایک عہد کا خاتمہ تھا۔

1.4 : سرسیداحمدخان کا عہد سیاسی وسماجی پس منظر

اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۵۸ء۔۱۷۰۷ء کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ روبہ زوال ہوگئی۔مرکز کے کمزور ہونے سے صوبوں میں خودمختاری کے جذبات اُبھرنے لگےاورمختلف طاقتیں بنگال،حیدرآباد،اودھ اور پنجاب میں خود مختار ریاستیں قایم ہوگئی تھیں۔حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں۔مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں اورسکھوں نے اس صورت حال سے فایدہ اُٹھایااورسلطنتِ مغلیہ کی سیاسی جمعیت کومنتشر کردیا۔احمدشاہ ابدآلی نے۱۷۴۳ءاور۱۷۶۷ء کے درمیان نوبار حملے کئے۔بےیقینی اورطوائف الملوکی فضاہرطرف پھیل گئی اورشاہی خزانہ خالی ہوگیا۔

شاہی گھرانے کی اس خستہ حالی پر میر تقی میرؔ نے کہا:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں　　تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

اور مصحفیؔ نے افسوس کیا کہ:

احوالِ سلاطین لکھوں کیا کہ اب آہ　　یعنی کہ مہ عید اب ان کو لبِ ناں ہے

فاقوں کی زبس مار ہے بیچاروں کے اوپر　　جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے

دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب، ظلم نہ بربریت کا شکار ہوا، جامع مسجد سے راجگھاٹ دروازہ تک معلوم ہوتا ہوتا تھا کہ ایک صحرا ہو۔ جہاں بربادی اور اینٹوں کے ڈھیر کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شہر کے کنوئیں لاشوں سے پٹے ہوئے تھے اور درختوں پر لٹکی ہوئی نعشوں کے گرد چیلیں اور کوے منڈلا رہے تھے۔ بقول ظہیرؔ دہلوی یہ عالم تھا کہ بازاروں میں:

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں　　نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

اس تاریخی شہر کے مٹنے پر سوداؔ نے اظہارِ افسوس کیا:

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا　　مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا

کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا　　عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بیرونی تجارتی کمپنیوں بالخصوص ولندیزیوں، انگریزوں فرانسیسیوں اور پرتگالیوں نے یہاں کی سیاست میں مداخلت شروع کردی اور آخر کار ۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملکی اقتدار حاصل کرلیا۔ اس افراتفری میں ہندوستان کا معاشرہ اور روایتی نظام درہم برہم ہوگیا، معاشرت کے طور طریق بدلے گئے، صنعت وحرفت میں انقلاب آیا، کمپنی کے تاجر دیسی چھوٹے دستکاروں سے کم قیمت پر مال خریدتے تھے اور مشینوں کی ایجاد نے گھریلو دستکاروں کو بے کار کردیا اور کمپنی کا ملازم بننے پر مجبور کیا۔ دیہی زندگی اور زراعت میں نت نئے مسایل پیدا ہوئے جنکی وجہ سے کاشتکاروں کو پے بہ پے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

شاہ عالم ثانی نے بنگال اور بہار کی دیوانی صرف چھبیس لاکھ روپے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو فروخت کردی اور بعض علاقوں میں لگان وصول کرنے کے لیے نیلامی بھی کی گئی۔

گورنر جنرل کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں استمراری بندوبست (پرمانٹ سیٹلمنٹ) رائج کیا جس کی رو سے لگان

وصول کرنے والوں کو زمین کے مالکانہ حقوق حاصل ہوجاتے تھے۔اس طریق کار سے کمپنی کی آمدنی میں استحکام آیا۔ سماج کے کمزور طبقے،عورتیں، بچے اور نیچی ذات کے اشخاص مذہبی پابندیوں اور سوشل ریت رواج کی جکڑ میں پھنسے تھے۔سماج کے نام لیوااونچے طبقے کے افراد ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرتے۔کوئی ان کا پرسان حال اور مددگار نہ تھا۔

۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کرلیا تو کمپنی نے شاہ عالم ثانی سے ایک نیا معاہدہ کیا جس کے نتیجہ میں سلطنتِ مغلیہ دہلی شہر اور مہرولی تک رہ گئی۔پھر اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے عہد میں یہ اور سمٹ کر صرف قلعہ معلیٰ تک محدود ہوگئی۔

بنگال سب سے پہلے انگریزوں کے حلقۂ اقتدار میں آیا، یہیں سے بیشتر اصلاحی اور انقلابی تحریکیں شروع ہوئیں۔مثلاً راجہ رام موہن نے اصلاح،قوم کا بیڑا اُٹھایا۔انھوں نے مختلف مذاہب اور علوم سے واقفیت پیدا کی اور اسلامی تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا اور عالمی مذہب کا تصور پیش کیا جس کی بناء توحید پر رکھی۔اس کی تفصیل ان کی کتاب ''تحفۃ الموحدین (۱۸۰۳ء) میں ملتی ہے۔سیداحمد خاں اس غیر معمولی مصلح سے متاثر ہوئے۔ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''کلکتہ کے بابورام موہن رائے کو جو نہایت لائق،ذی علم،متین ومہذب شخص تھے اور برہموسماج کے بانی تھے اس ارادے سے بلایا گیا کہ بادشاہ کی طرف سے وکیل کرکے لندن بھیجا جائے چنانچہ وہ دلی آئے اور پادشاہ کی ملازمت کی اوران کو راجہ کا خطاب پادشاہ کی طرف سے دیا گیا آخر کار وہ پادشاہ کے وکیل ہوکر لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۷ کو لندن پہنچے اور ۱۸۳۳ء مطابق ۱۲۴۹ھ کے وہیں مرگئے۔''

شمالی ہند میں سیداحمد بریلوی کی سیاسی تحریک پر شاہ ولی اللہ کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔یہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکال دینے کی سب سے زیادہ منظّم کوشش تھی۔انھوں نے بھی اپنے ملک کو دارالحرب سمجھا۔اس تحریک کی نوعیت راجہ ہندوراؤ ہولکر کو لکھے گئے ایک خط سے واضح ہوجاتی ہے کہ:

(پردیسی سمندر پار کے باشندے دنیا جہاں کے مالک بن گئے اور مال بیچنے والے تاجر سلطنت پر قابض ہوگئے۔بڑے امیروں اور رئیسوں کی ریاست برباد ہوئی جو حکومت وسیاست کے مردِمیدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے بس بیٹھے ہیں اس لیے مجبوراً چند غریب اور اہلِ فقر کمربستہ ہوگئے۔جس وقت ہندوستان غیر ملکیوں اور دشمنوں سے

خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں کامیاب ہوں گی تو حکومت کے منصب اور عہدے ان کو ملیں گے جوان کے خواہش مند ہوں گے۔''

انگریزوں کی آمد نے جہاں تخریبی رجحانات کو بڑھاوا دیا وہیں اس کے کچھ تعمیریک پہلو بھی سامنے آئے۔ مثلاً انیسویں صدی میں ریل، تار برقی، بجلی چھاپہ خانہ اور دیگر جدید ایجادات نے ملک کو بالواسطہ فایدہ پہنچایا۔ ہر چند کہ یہ سہولتیں انگریزوں نے اپنے لیے فراہم کی تھیں مگر رفتہ رفتہف ہندوستانی بھی ان سے مستفید ہوئے اور ملک میں جدید تمدن کی راہ ہموار ہوئی۔

انگریزوں نے سرکاری ملازم تیار کرنے اور دیگر اغراض کی تکمیل کے لیے انگریزی تعلیم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۷۸۱ء میں گورنر جنرل وارن ہیٹینگز نے اسلامی فقہ کی تدریس کے لیے کلکتہ میں مدرسہ عالیہ قائم کیا۔ مشرقی علوم کی ترویج کے لیے ''بنگال (ایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۷۸۴ء میں وجود میں آئی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے دس سال بعد ۱۷۹۱ء میں جوناتھن ڈنکن نے ہندو قانون اور فلسفہ کو پڑھانے کے لئے سنسکرت کالج بنارس میں کھولا۔ ماہر سنسکرت بشپ کیریؔ ۱۷۹۳ء میں تبلیغ عیسائیت کے لیے کلکتہ آیا اور اس کی مدد کے لیے دو نوجوان بپٹپٹ مشنری مارشلؔ اور وارڈؔ بھی آئے جو سیسرام پور ابنگال میں بس گئے۔ ان پادریوں نے ۱۷۹۹ء میں نجی مدارس کھولے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا جس میں بحکم گورنر جنرل ویلزؔلی سنسکرت کا پروفیسر بشپ کیریؔ کو مقرر کیا گیا۔ ۱۸۰۸ء کے اعلان کے مطابق کمپنی کی حکومت نے مذہب کے معاملہ میں غیر جانب داری کا رویہ اختیار کیا اور ۱۸۰۹ء میں ایک فلاحی ادارہ کلکتہ میں قایم کیا گیا اور مشنریوں کو ہندوستان میں ۱۸۱۳ء تک رہنے کی اجازت دی گئی۔ ان مختلف اداروں کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو انتظامی امور میں سہولت بہم پہنچائی تھی۔

صحافت کی ابتدا نے بھی ملک کی صورتِ حال کو بدلا۔ انگریزی زبان میں تو اخبارات نکل رہے تھے۔ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے اردو اخبار ''جامِ جہاں نما'' کا اجراء ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ مختلف شہروں سے اخبارات میں اضافہ ہونے لگا۔ ۱۸۴۱ء میں ''دہلی اخبار'' جاری ہوا اور یہ سلسلہ پھیلتا گیا جو عوام کی آگاہی اور ذہنی کشادگی کا باعث ہوا۔ دلی کالج کی ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی، نے ۱۸۴۲ء میں علمی کتابوں کے تراجم کی مہم شروع کی جس سے ہندوستان میں عربی علوم وفنون اور افکار ورجحان سے واقفیت کا شوق بڑھا اور لوگوں کو وہاں کی کتب کا مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ وسائل آمد ورفت کے بہتر ہونے سے بھی زندگی میں سہولت پیدا ہوئی۔

ہندوستانی معاشرہ میں جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اس نے ۱۸۵۷ء میں بڑی تشویشناک صورت

اختیارکرلی۔

سیداحمدخاں نے اس کا تجزیہ کیا کہ:

''بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہوگیا تھا۔صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سالِ گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگادی۔''

اس ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ملک کے مختلف علاقوں کے سپاہی، زمیندار، کسان اور دستکار نے مشترکہ طور پر انگریزوں کے ہندوستان سے اخراج کی کوشش کی۔اس تصادم کی ایک وجہ امراء اور صوبیداروں میں بے اطمینانی کی لہر تھی کیونکہ انگریزوں نے ان سے من مانے وعدے کرکے توڑ دیے تھے۔پھر سندھ اور اودھ کا الحاق کرلیا تھا۔لارڈ ڈلہوزی کی دست انداز پالیسی نے ۱۸۵۴ء میں جھانسی کی ریاست کو سلطنتِ انگلشیہ میں شامل کرلیا اور اسی سال پیشوا باجی راؤ دوم کی وفات کے بعد ان کے لے پالک بیٹے کو حکومت نے پنشن دینے سے انکار کردیا اور شاہی خاندانوں کے دیگر افراد بھی جانشینی سے محروم کردیے گئے۔سپاہی شاکی تھے کہ فوج میں ان کا کوئی مستقبل نہیں۔اعلیٰ عہدوں پر انگریز فائز تھے اور دیسی سپاہیوں کی تنخواہیں قلیل ہوتی تھیں اور محاذِ جنگ پر بھی کوئی بھتہ نہیں ملتا تھا اور ان کے مذہبی احساسات کو بھی مجروح کیا جاتا تھا۔ان وجوہ کی بناء پر انگریزوں سے نفرت کا جذبہ بڑھا اور بہادر شاہ ظفر یک جہتی کی علامت قرار دیے گئے اور ملک کی آزادی کی خاطر ہندو مسلمان دوش بدوش لڑے۔۱۰رمئی ۱۸۵۷ء کو شورش میرٹھ سے شروع ہوئی اور چاروں طرف پھیل گئی۔ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریز فوج نے دہلی پر اور لکھنؤ پر قبضہ کیا۔حضرت محل اودھ میں تحریک آزادی کی تنظیم کرتی رہیں اور شکست کے بعد نیپال چلی گئیں۔

یہ ایک سیاسی نظام کا خاتمہ ہی نہ تھا بلکہ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کا تہذیبی سرمایہ بھی برباد ہوگیا اور علم و ہنر کے مراکز تباہ ہوگئے۔غالب نے ایک خط میں اس حالِ زار کا نقشہ کھینچا کہ:

''ولی اللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے۔نہ قلعۂ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔''

انھوں نے اپنے ایک اور خط بنام علاء الدین احمد خاں میں لکھا:

گھر سے بازار سے نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ، ذرۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

نئے زرعی قوانین اور مشینوں کی ایجاد سے بیروزگاری بڑھی۔علماء کی ملازمتیں چھین لی گئیں ریاستی افواج معطل کسان اور اہل حرفہ تباہ حال تھے۔راسخ نے اس تباہی کا ذکر کیا:

ہنرمند کا ہے جگر ریش ریش　　نہیں جاتا اب کوئی پیشہ بھی پیش
گدائی کا کاسہ لیے دربدر　　ہیں آوارہ اربابِ فضل وہنر

آخر انیسویں صدی کے اس شکست وریخت کے دور میں مسلمانوں نے بھی اپنے تشخص کی بازیافت کی کوشش کی۔ان میں سیداحمد خاں ذہنی بیداری کی ایک علامت ہیں۔

مشرق کے اس بحرانی دور میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں کہ کسی قوم میں معاشرتی اور اقتصادی استحکام اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب جدید مغربی علم وفن کو مشرقی علوم واقدار کے ساتھ ساتھ حاصل کیا جائے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ضروریاتِ زمانہ اور احساساتِ قومی نے علی گڑھ تحریک کو جنم دیا۔

1.5: خلاصہ

سرسیداحمد انیسویں صدی کی ایسی عبقری شخصیت کا نام ہے۔جنکی بدولت ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت ذہن وفکر اور ان کے علمی وادبی خدمات نے تاریخ اور ادب دونوں پر زبردست انقلاب لایا ہے۔اس عظم ہستی نے ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں دلی کے ایک سید گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں۔ان کے والد سید متقی محمد شہنشاہ اکبر ثانی کے مشیر تھے۔دادا سید ہادی عالمگیر شاہی دربار میں اونچے منصب پر فائز تھے،اور نانا جان خواجہ فریدالدین شہنشاہ اکبر ثانی کے دربار میں وزیر تھے۔پورا خانوادہ مغلیہ دربار سے وابستہ تھا۔ان کی والدہ عزیزالنساء نہایت نیک خاتون تھیں۔سرسید کی ابتدائی تعلیم پر ان کی ترتیب کا بہت گہرا اثر ہے۔اپنے نانا خواجہ فریدالدین سے انھوں نے تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے خامولوی خلیل اللہ کی صحبت مین عدالتی کام کاج سیکھا۔

سرسیداحمد خان کا عہد بے حد پرخلفشار تھا۔۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی سیاسی ومعاشی حالاتِ زندگی قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھی۔مرکزی حکومت یعنی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔برطانوی حکومت نے پورے ہندوستان کے نظم نسق کے مالک بن گئے تھے۔خاص طور سے مسلمانوں سے جاگیریں،عہدے اور منصب چھین لیے گئے تھے۔ہندوستانی مسلمان اس وقت انگریزون کی نگاہ میں سب سے بڑے مجرم تھے۔ایسے مایوس کن اور پرآشوب فضا میں سرسیداحمد خان کی علمی وادبی ملی وطنی وقومی بےلوث خدمات نے قوم کی ڈوبتی کشتی کو ساحل پر لانے کی

کامیاب کوشش کی۔ سرسید احمد خاں نہایت ذہن اور دور اندیش مدبر و مفکر اور سچے معلم قوم تھے۔ انہوں نے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے سب اہم کام یہ کیا کہ مسلمانوں کو جدید علم وفنون سے روشناس کرایا جائیں۔ اپنی اس کوشش کو ایک منظّم طریقے ایک تحریک کے روپ مین پیش کیا، جیسے پوری دنیا سرسید احمد خان انیسویں صدی کے ہندوستان کے سب سے بڑے مدبر تھے۔ جن کی فکر و عمل نے قوم کو اندھیرے سے نکالکر روشنی کے راہ پر چلنے پر گامزن کیا ہے۔

1.6 : نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطرون میں دیجیے۔

ا۔ سرسید احمد کی حالاتِ زندگی کا مختصر جائزہ لیجیے

۲۔ سرسید احمد کی شخصیت اور مزاج کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۳۔ سرسید احمد خان کی تعلیمی سفر پر رشنی ڈالئے۔

۴۔ سرسید احمد خان کے عہد کے سیاسی وسماجی پس منظر کو مختصراً پیش لیجیے۔

1.7 : فرہنگ

الفاظ	معنی
معتبر	اعتبار
عبقری	اعلیٰ
پس ماندگی	بدحالی
اعتراف	مان لینا
دانشمند	اہل علم
معلم قوم	قوم کی اصلاح کرنے والا
اقتدار	حکومت / اختیار
وصول کرنا	حاصل کرنا

تخریبی نقصان دہ
وسائل ذریعے

1.8 : سفارش کروہ کتابیں

۱۔ سرسیداحمدخان اوران کا عہد ڈاکٹرثریاں حسین
۲۔ سرسیداورعلی گڑھ تحریک خلیق احمد نظامی
۳۔ تاریخ ادب اردو ڈاکٹرجمیل جالبی
۴۔ سیداحمد دہلوی : حیات اورکارنامے زہرہ جعفری
۵۔ سرسیداقبال اورعلی گڑھ اصغرعباس

☆☆☆☆☆

•باب : دوم

سرسیداحمدخان کی علمی ووطنی خدمات

اکائی کے اجزاء

2.1 مقاصد

2.2 تمہید

2.3 موضوع کی وضاحت

2.3.1 سرسیداحمدخان بحیثیت سوشل ریفارمر

2.3.1.1 معاشرہ کی اصلاح کا منصوبہ

2.3.1.2 معاشری اصلاح کا خاکہ

2.3.1.3 تعلیم کی اصلاح اورترقی

2.3.2 سرسیداحمدخان بحیثیت مفکراعظم

2.4 خلاصہ

2.5 نمونے کے امتحانی سوالات

2.6 فرہنگ

2.7 سفارش کردہ کتابیں

2.1 : مقاصد

اس اکائی کے مطابعہ کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔

☆ سرسیداحمدخان کی علمی ووطنی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ سرسیداحمدخان کے معاشرتی اصلاح کے منصوبے سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ سرسیداحمدخان کی تعلیمی اصلاح اورترقی سے واقف ہوسکیں گے۔

2.2 : تمہید

سرسید احمد خاں تحریک میں وطنی وقومی خدمات کو بنیادی مرکزیت حاصل تھی۔انیسویں صدی کی عبقری شخصیت نے اپنی پوری زندگی ملک وقوم اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردی۔ایسی جلیل القدر ہستی نے اپنی فکر وعمل کے ذریعے بے سمت معاشرے کوراہِ راست پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد ہندوستانی معاشرہ اس خستہ حال ہو چکا تھا کہ قوم کی معاشرتی حالت کوفورا اصلاح کی ضرورت تھی۔ایسے پُر آشوب ماحول میں ہندوؤں اور مسلماوں دونوں قوم ایک بے راہ روی کی شکار تھی۔لہذا ہندوؤں سماج کی بھلائی کے لئے کئی علماءاور رہنماؤں مثلا راجہ رام موہن رائے، کیشپ چندرسین،ایشور چندرودیا ساگر جیسے معلم نے اپنی معمولی خدمات سے معاشرے کو بہتر بنایا۔جبکہ اس پُر آشوب فضاء میں ہندوستانی مسلمانوں معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے والے مصلح کا فقدان تھا۔لیکن سرسید احمد خاں واحد شخص تھے جن کی زندگی کا مشن معاشرہ کی بھلائی اور بہتری تھا۔لہذا سرسید احمد خان کی بے لوث ملی ووطنی خدمات کا تفصیل سے گفتگو اس باب کیا گیا ہے۔

2.3: موضوع کی وضاحت

2.3.1 : سرسیداحمدخان بحیثیت سوشل ریفامر:

سرسید احمد خان کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے وہ ایک ایسی عبقری شخصیت کے مالک تھے کہ انکی زندگی کا پہلو ملک قوم معاشرہ وسماج کے فلاح و بہبود کے لیے مخصوص تھا۔ایسی جلیل القدر ہستی تھی کہ انکی ہر فکر وعمل میں ایک انقلاب تھا۔قوموں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی دنیا میں لانے والا واحد شخص تھا۔جس نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو درماندگی کے دلدل سے نکال کر صرات مستقیم پر چلنے کی ہدایت کی تھی۔اپنی پوری زندگی صرف ایک ہی پیغام کو چاروں طرف پھیلایا وہ علم حاصل کرو علم حاصل کرو تھا۔ہندوستانی مسلمانوں کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے انہوں نے کئی اہم اور غیر معمولی اقدامات اٹھائے۔جس کا بنیادی مقصد قوم کی بہتری اور ترقی تھا۔ذیل میں چند اہم نکات کو درج کیا گیا ہے۔جس کی بنا پر سرسید احمد خان کی ہمہ گیر شخصیت میں سوشل ریفرمر کے پہلو سے طلباء بخوبی واقف ہو جائے۔

2.3.1.1 : معاشرہ کی اصلاح کا منصوبہ

ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کی معاشری حالت اس قدر خراب تھی کہ ملک وقوم کے خیرخواہ فوری اصلاح کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے۔تاہم ہندوؤں کی حالت اس اعتبار سے بہتر تھی کہ ان میں راجہ رام موہن رائے ،کیشب چندرسین،ایشر چندرودیاساگر،سریش چندر بھٹاچارجی،رام تنولا،ہیٹری اوردیا نندسرستی جیسے مصلح پیدا ہوگئے تھے۔جن کی کوششوں سے ہندو معاشرہ میں کئی خرابیوں کی اصلاح ہوگئی تھی۔اوروہ زمانے کے تقاضوں کومحسوس کرکے اپنی معاشری،تعلیمی اوراقتصادی حالت کوبہتر بنانے پر پوری توجہ کررہے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔سیاسی زوال کے بعدوہ اقتصادی حیثیت سے بھی تباہ ہوگئے تھے۔جدید علوم حاصل کرنے پرکسی طرح رضامندنہ ہوتے تھے۔معاشرہ میں ان کا وقارگرگیا تھا۔اورغیراسلامی رسوم ورواج اوردوسری قوموں کے اثرات نے مسلم معاشرہ کی حالت بگاڑدی تھی۔مدت دراز سے مسلمانوں کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جارہی تھی۔مگرسرسیداحمدخان سے پہلے ان کوکوئی ایسا مصلح نہ ملا تھا جومعاشری اصلاح کے لیے کامیاب جدوجہدکرکے تمام خرابیوں کودورکرتا۔اگرچہ اس زمانے میں کچھ لوگ ایسے تھے جومعاشری اصلاح کی ضرورت کو محسوس کرتے تھےلیکن وہ خوداس میدان میں پیش قدمی کرنے پرتیارنہ تھے۔اوراس بات کے خواہاں تھے کہ کوئی اور پہل کرے۔کیونکہ ان میں بری رسموں کوتوڑنے اوراصلاح کرنے کی جرات نہ تھی۔

سرسیداحمدخان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بُری رسموں اور رواج کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ اصلاح کےخواہش مند پوری جرات اورعزم واستقلال کے ساتھ ان کی مخالفت نہ کریں گےاوران رسوم ورواج کے خلاف خودعمل کرکے دوسروں کے لیےقابلِ تقلیدمثال قایم نہ کردیں گے۔سرسیداحمدخان کا یہی وہ نظریہ تھا جس کے مطابق انھوں نے معاشرہ کی ترقی واصلاح کا کام شروع کیا۔پہلے تو خودبُری رسموں کوچھوڑااوراچھی باتیں اختیار کیں۔پھراپنے دوستوں اورہم خیال لوگوں کواس پرآمادہ کیااوراس کے بعد پوری قوم کواس کی ترغیب دی اوران تمام تدبیروں سے کام لیا جومعاشرہ کی اصلاح وترقی میں مدددےسکتی تھی۔سرسیداحمدخان کا خیال تھا کہ وہ آدمی نہایت کمینہ ہوتا ہے جوکہتا کچھ ہےاورکرتا کچھ ہےاوراس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جوشریعت کےحکم سے واقف ہو اورپھررسم ورواج کی شرم یالوگوں کےلعن وطعن کےڈرسےاس کےکرنے میں تامل کرے۔چنانچہ انھوں نے جب اپنی اصلاح تحریک شروع کی تواس کوتحریروتقریراورمحض زبانی تلقین تک محدودنہ رکھا بلکہ انھوں نے جوکہااس پرعمل بھی کیا۔معاشرہ کے لیےمضراورطرح طرح کی خرابیاں پیدا کرنے والی رسموں کوترک کردیا۔اوراچھی رسموں کا آغاز

کیا۔مختلف فرقوں کے مسلمانوں سے برادرانہ تعلقات قائم کرکے دینی اخوت کی اہمیت وضرورت واضح کی۔ ہندوؤں اور دوسرے ہم وطن قوموں سے گوارمراسم رکھے اور اپنی اصلاح تحریک سے ان کو بھی فائدہ پہنچایا۔ انگریزوں سے میل جول بڑھایا اوران کے ساتھ کھانا پینا شروع کرکے مسلمانوں اورعیسائیوں کے درمیان دوستی اور تعاون کا رجحان پیدا کردیا۔مسلمانوں کو غیر اسلامی عقائد ونظریات کی گرفت سے آزاد کرنے اور اسلام کے صحیح اصول ومقاصد سے آگاہ کرنے کے لیے ان لوگوں کے خلاف زبردست مہم شروع کی جو مذہب کا نام لے کر گمراہی پھیلا رہے تھے۔ اوراس کام کی وجہ سے قدامت پرستوں نے ان کی جو زبردست مخالفت کی اس کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا خود اپنی قوم میں جو برائیاں تھیں ان کو چھوڑ کر ترقی یافتہ قوموں کی خوبیاں اختیار کیں۔ نئے علوم سے خود بھی ممکنہ حدتک واقفیت حاصل کی اوراپنے لڑکوں کو جدید طرز کی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔اورمسلمانوں کی معاشری اصلاح اورتعلیمی ترقی کی تجویزوں کو زیادہ بہتر اور مفید طریقہ پر روبہ عمل لانے کے لیے یورپ کا سفر اختیار کیا جو اس زمانے میں کافی مشکل کام تھا۔اس طرح سرسید نے معاشری اصلاح کے لیے لوگوں کے سامنے عملی مثال بھی پیش کردی اور ان خرابیوں کو دور کرنے کی ہر جہتی کوشش کی جوان کے خیال میں معاشرہ کی فلاح وبہبود اور ترقی واصلاح میں حائل تھیں۔

2.3.1.2 : معاشری اصلاح کا خاکہ

تہذیب وترقی کے یہ وہ محرکات اوراصول تھے جو سرسید نے پیشِ نظر رکھے۔کسی قوم کو مہذب بنانے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔معاشرہ کی ترقی وتہذیب میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔اورمہذب قوموں سے کس حدتک استفادہ کرنا ضروری ہے اس کا ان کو بخوبی اندازہ تھا اورانھوں نے معاشری اصلاح کی جو تحریک شروع کی اس میں ان باتوں کا مناسب لحاظ رکھا۔ یوں تو ہندوستان کی تمام قوموں کی معاشری حالت اصلاح طلب تھی لیکن مسلمانوں کے معاشرہ میں سب سے زیادہ خرابیاں پائی جاتی تھیں۔اورانہی کی اصلاح کرنا سرسید احمد خان کا اولین مقصد تھا۔کسی قوم کو تہذیب وترقی کی طرف مائل کرنے اوراس کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اس کو یہ بتلانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو کن چیزوں کی اصلاح کرنی چاہیے۔ چنانچہ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی دینی، معاشری اوراقتصادی اصلاح کے لیے ایک خاکہ مرتب کیا اورمندرجہ ذیل امور کی اصلاح پر مسلمانوں کو توجہ دلائی۔

۱) آزادی رائے

مسلمانوں کی رائے اوران کے خیالات ہرایک امر میں تقلید کرتے کرتے اوررسومات کے پابند رہتے رہتے پست اور پامال ہوگئے ہیں جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تلک کہ رائے کہ آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آئے گی۔

۲) درستی عقائد مذہبی

ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مذہبی جواُن کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جوان کے دلوں میں ہیں اور جن کا اُن کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شرکیہ اُن کے دلوں میں ہیں پس اُن کی تہذیب کرنا اوراپنے عقائد کو ہیئت اسلام کے مطابق کرنا اوراس پر یقین رکھنا تہذیب وشائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

۳) خیالات وافعال مذہبی

ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اورتوہمات ایسے موجود ہیں جن کووہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کرادا کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کو مذہبِ اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ یا تو وہ خود بدعت ہیں یارسومات وخیالات کفر و شرک ہیں جو باعث ہمارے نامہذب ہونے کے ہیں۔ پس ہم کومہذب ہونے کے لیے اُن کی تہذیب درکار ہے۔

۴) تدقیق بعض مسائلِ مذہبی

ہمارے مذہب کے بعض صحیح اوراصلی مسائل ایسے ہیں جن کی پوری پوری تحقیق وتدقیق اب تک نہیں ہوئی اور اگرچہ وہ مسائل فی نفسہ صحیح ودرست ہیں الا بیان واضح اورتحقیق کامل نہ ہونے کے سبب علومِ عقلیہ کے برخلاف اورتہذیب وشائستگی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ پس ہم کوان کی تشریح وتہذیب کرنی چاہیے۔

۵) تصحیح بعض مسائل مذہبی

ہم کچھ شک نہیں کرتے کہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں یایوں کہوبعض ایسے مسائل کا ہونا ممکن ہے جن میں متقدمین نے غلطی کی ہو۔ پس ان کو بحث میں لانا اورایک منقح ٹھہرانا ہمارے لیے ضروری ہے۔ان تمام چیزوں کوجو مذہب سے متعلق ہیں ہم نے تہذیب وشائستگی میں اس قدر داخل کیا ہے کہ قوم کے مہذب ہونے پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پس جس قدر جس قوم کے مذہب میں نقص ہے اتنا ہی اس کی پوری تہذیب میں

نقصان ہے۔

۶) تعلیم اطفال

مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گذشتہ اور حال پر نظر کر کے ایسا طریقۂ تعلیم متعین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔

۷) سامانِ تعلیم

ہمارے لیے صرف طریقۂ تعلیم متعین کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ آپس کی مدد اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سامان بھی مہیا کر دینا ضروری ہوگا۔

۸) عورتوں کی تعلیم

کچھ شبہ نہیں ہے کہ قومی تہذیب اور شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور ان کو دستکاری سکھانے کے لیے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔

۹) ہنر وفن وحرفہ

اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن وحرفہ کو پھیلانا و ترقی دینا قومی تہذیب کے لیے ایک بڑا جزو ہے۔ یہ تمام باتیں وہ ہیں جو مجموعاً و منفرداً ہر شخص سے اور کل قوم سے علاقہ رکھتی تھیں۔ اب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہر ایک شخص کی ذات سے علاقہ رکھتی ہیں۔ ان کا اثر کل قوم پر ہوتا ہے۔ اور ہر ایک میں ان باتوں کے ہونے سے قومی تہذیب وشائستگی قرار پاتی ہے۔

۱۰) خودغرضی

سب سے بڑا عیب ہم میں خودغرضی کا ہے اور یہی مذموم سبب قومی ذلت و نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرورت ہے کہ رفاہِ عام کا جوش دل میں پیدا کریں۔ اور یقین جانیں خودغرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔

۱۱) عزت اور غیرت

غیرت اور عزت یہ دونوں آپس میں ملی ہوئی ہیں کہ کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ جس کو عزت ہے اس کو غیرت ہے۔ جس کو غیرت ہے اس کو عزت ہے۔ اب مسلمانوں میں ان دونوں چیزوں کی کمی کیا بلکہ وہ معدوم ہوگئی ہیں۔ اگرچہ میری اس بات سے لوگ متعجب ہونگے کہ مسلمان کیونکر ایسے ہیں اگر ایسی ان کو کوئی گالی دے جان

نکال لیں مرجائیں پراپنی شان نہ جانے دیں۔شادی مہمانی میں ہرگز ناک کٹائی نہ ہونے دیں۔روپیہ قرض لیں اورشادی دھوم دھام سے کریں۔

۱۲) ضبطِ اوقات

ہماری قومی تہذیب وشائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ہرایک کواپنے خاص کاموں میں اپنے خاص اوقات کواور جوکام عام قوم سے متعلق ہیں ان میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیے کہ یہ ہی ایک اصل اصول قومی تہذیب وشائستگی کا ہے۔

۱۳) اخلاق

بالفعل مدارِاخلاق ہم لوگوں میں اس پردہ گیا ہے کہ جس کسی سے ملے کچھ ہنس کرسلام کیا کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں۔دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنائیں کچھ اپنی جھوٹی نیازمندی کا اظہار کیا۔کچھ ان کی جھوٹی تعریف کی آؤ بھگت کی۔اوردل میں کہا کہ خوب اُلّو بنایا۔جب وہ چلا گیا تو یا تو برا کہنے لگے یا جو باتیں کی تھیں ان کا نقش برآب کا سا بھی نشان نہ تھا۔

۱۴) صدقِ مقال

یہ تو وہ صفت ہے کہ جو انسان کو قطب و ابدال کے درجے سے بھی بڑھا دیتی ہے۔مگر یہاں ہمارا مطلب دنیاوی باتوں میں سچے پن کا ہے۔ضرورت ہے کہ سب لوگ سچ میں عزت سمجھیں۔ایک شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھے تا کہ قاء۔کوقبل کلام اس بات کی غیرت ہو کہ سامع میرے اس قول کو جھوٹ نہ سمجھے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں کہ کیوں جھوٹ نہ سمجھے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں کہ کیوں جھوٹ بولتا ہے۔آپس میں ایک دوست دوسرے کو کہتا ہے کہ میاں کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ان باتوں سے جھوت کے عیب اور جھوٹ کے طعنہ کی غیرت دل سے جاتی رہتی ہے جو بڑا سبب ذلت قومی اور نامہذب و ناشائستہ ہونے قوم کا ہوتی ہے۔

۱۵) دوستوں سے رسم وراہ

ہماری راہ ورسم جو دوستوں سے ہے،اُس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ہم آپس میں اس طرح پر نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ان تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنی ایک بڑا ضروری امر ہے۔

۱۶) کلام

طرزِ گفتگو اور سیاق کلام بھی جزو اعظم تہذیب و شائستگی کا ہے جس کی ہم میں بہت کسر ہے۔ ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں ہوتے ہیں نہایت کم مستعمل ہیں۔ اس لیے اس کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

۱۷) لہجہ

اس کو بھی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ اکھڑ لہجہ یا اس قسم کی آواز جس سے شبہ ہو کہ آدمی بولتے ہیں یا جانور لڑتے ہیں ناشائستہ ہونے کی نشانی ہے۔ کسی قدر اس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔

۱۸) طریق زندگی

یہ تو ہمارا ایسا ابتر وخراب ہے کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریقِ زندگی ہمارے طریقۂ زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

۱۹) صفائی

بدن اور گھر اور لباس سب کی صفائی تہذیب میں داخل ہے۔ انگریزی مثل ہے کہ خدا اور خدا کے بعد صفائی۔ مسلمانوں کے ہاں بھی حدیث ہے الطھور شطر الایمان۔ مگر ہم مسلمان بہت کم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ صورت دیکھو تو واہ واہ۔ گھر دیکھو تو سبحان اللہ۔ اس لیے ہم کو صفائی پر توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

۲۰) طرز لباس

لباس کی قطع اور وضع درست ہونی بہت بڑا نشانی تربیت یافتہ ہونے کی ہے۔ دیکھو کہ تمام دنیا میں جس قدر وحشیانہ پن کم ہوتا چلا گیا اس قدر لباس کی درستگی ہوتی چلی گئی۔ پس ہم کو اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو کر دیکھنا چاہیے کہ کس قسم کی ترمیم کے لائق ہے۔

۲۱) طریق اکل و شرب

اگر ہم تعصب نہ کریں اور انصاف سے دیکھیں تو ہمارا طریق اکل و شرب ایسا ہے کہ جو قومیں ہم سے زیادہ صفائی سے کھاتی ہیں جب ہم کو کھاتے دیکھتی ہے تو ان کو قے آتی ہے۔

۲۲) تدبیر منزل

ہماری تدبیر منزل یعنی انتظام خانہ داری ایسی ابتر وخراب ہے جس میں نہایت درجے کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

۲۳) رفاہ عورتوں کی حالت میں

غیرقوموں نے ہمارا برتاؤ جب عورتوں کے ساتھ خیال کیا ہے اور لکھا ہے اس میں یقینی بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں ہیں۔مگر جو اصلی حالت عورتوں کی بلاشبہ ترقی کے لائق ہے اور ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ ہے، وہ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔

۲۴) کثرتِ ازدواج

اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کم ہے مگر بھی زیادہ ہے اور نہایت نالائقی سے خدا و خدا کے رسول کے حکم کے برخلاف برتا جاتا ہے۔ یہ ایسی بدخصلت مسلمانوں میں جاری ہے جس کی بدولت اسلام کو شرمندگی و بدنامی ہے۔

۲۵) غلامی

اگرچہ ہندوستان میں انگریزوں کی بدولت غلامی بدرسم موقوف ہوگئی ہے مگر ہمارے مہذب و شائستہ ہونے کے لیے صرف اس کا موقوف ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہمارے دل میں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ در حقیقت یہ رسم خلاف مسلمانی مذہب کے تھی اور فی نفسہ خراب و نالائق تھی۔اس لیے ہم کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۶) رسوماتِ ادی

جو رسومات شادی کی ہم مسلمانوں میں رائج ہیں۔ایک بھی ان میں سے مذہب اسلام کی رسم نہیں ہے اور جیسی نالائق اور نامہذب وہ رسمیں ہیں شاید ہی اور کوئی رسم اس سے زیادہ ناشائستہ اور نامہذب ہوگی۔

۲۷) رسوماتِ غمی

اس طرح رسوماتِ غمی کا حال ہے کہ برخلاف مذہبِ اسلام کے ہم نے نامہذب و ناشائستہ رسمیں اختیار کر لی ہیں۔خدا رحمت کرے مولوی اسماعیل پر جن کی بدولت بہت سی نامہذیب و ناشائستہ رسمیں شادی و غمی کی ہم میں سے چھوٹ گئی ہیں۔مگر اس پر بھی بہت کچھ باقی ہیں۔جن کی تہذیب پر ہم کو متوجہ ہونا چاہیے۔

۲۸) ترقیٔ زراعت

زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں کی حالت کی بہتری قومی ترقی اور تہذیب میں بڑا اثر رکھتی ہے۔اور اس میں ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔

۲۹) تجارت

یہ سب سے آخری جزو ہے قومی ترقی اور تہذیب وشائستگی حاصل کرنے کا۔ اور ہم مسلمانوں میں سے یہ امر بالکل متروک ہوگیا ہے پس ہم کو اپنی قوم میں اس کا رواج دینا اور عمدہ اصول پر اس کو قائم کرنا ایک بہت بڑا امر واسطے تہذیب وشائستگی حاصل کرنے کے ہوگا۔

تعلیم کی نوعیت کو بدلنا اور اس کو ترقی دینا۔ دینی عقائد کو درست کرنا۔ اخلاق و عادات کو سنوارنا، تہذیب وتمدن اور طرزِ معاشرت کی خرابیاں دور کرنا۔ رسوم و رواج کی برائیوں کو مٹانا۔ عورتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا اور ملی اخوت، قومی اتحاد اور مذہبی رواداری کا احساس بیدار کر کے معاشرہ میں یک جہتی و ہم آہنگی پیدا کرنا سر سید کی اصلاحی تحریک کے خاص مقاصد تھے اور اس کے حصول کے لیے انھوں نے بہت منظّم جد وجہد کی۔

2.3.1.3 : تعلیم کی اصلاح اور ترقی

سر سید احمد خان اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کا ایک بہت بڑا اور بنیادی سبب عوام کی جہالت اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ناقص تعلیم و تربیت ہے اور معاشرہ کی حالت درست کرنے کے لیے جن اصلاحات کی ضرورت ہے وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتیں جب تک کہ قوم کی تعلیمی حالت کو بہتر نہ بنایا جائے۔ لیکن اس زمانے میں ہندوستان کے جو حالات تھے ان میں تعلیم کی اصلاح کرنا اور اس کو پھیلانا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ ملک پر ایک غیر قوم کی حکومت تھی اور اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ پوری قوم کی تعلیم کا انتظام کر سکے گی یا سرکاری مدارس میں مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی اور مفید مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست کرے گی۔ تعلیم کی ترقی میں دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان قوم تقریباً ایک ہزار سال سے ایک ایسے طرزِ تعلیم کی پابند چلی آرہی تھی جس میں عقلی ونقلی ہر قسم کے علوم کو ایک قسم کی مذہبی نوعیت دے دی گئی تھی اور اس میں تبدیلی کا تصور تک نہ کیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں طرز تعلیم اور مروجِ علوم کو بدل کر نئے اور مفید علوم وفنون سکھانے کے لیے مغربی طرز کے تعلیمی ادارے قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سر سید احمد خان ان مشکلات کو محسوس کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی خوب جانتے تھے کہ جب تک ان مشکلات کو دور کر کے تعلیمی حالت درست نہ کی جائے گی مسلمان کسی صورت میں بھی ترقی نہ کرسکیں گے۔

☆ : مدارس کا قیام

۱۸۳۵ء میں حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کی۔ ہندوؤں نے تو اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن مسلمانوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور نہ صرف تعلیمی بلکہ معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی مسلمانوں پر اس کا برا اثر پڑا۔ سرسید احمد خان نے جب یہ حالت دیکھی تو انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اور تعلیم کے بارے میں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایک رسالہ لکھا جس میں سرکاری مدرستوں کی تعلیم اور انتظام میں خرابیوں پر اعتراض کیا اور انگریزی تعلیم دینے کی ضرورت اور اس کے فوائد بیان کیے۔ ۱۸۶۴ء میں سرسید احمد خان نے ایک مدرسہ غازی پور میں قائم کیا۔ جس کی عمارت اور اخراجات کے لیے چندہ جمع کیا۔ اور اس کے افتتاح کے موقع پر اس بات کو واضح کیا کہ ہندوستان اسی وقت ترقی کر سکے گا جب اس ملک میں بسنے والی قومیں اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر عمل کریں گی اور اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ اس مدرسہ میں انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور اس کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی جس میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔ سرسید احمد خان کا خیال تھا کہ اس مدرسہ کو کالج بنا دیں لیکن اسی سال غازی پور سے ان کا تبادلہ ہو گیا اور یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

☆ سائنٹفک سوسائٹی

سرسید احمد خان یہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید علوم و فنون سے واقف ہوں اور پرانے مروجہ علوم کے بجائے جو ان کے لیے بالکل بیکار تھے نئے اور مفید علوم حاصل کریں۔ لیکن نئے علوم کی کتابیں انگریزی میں تھیں اور مسلمان انگریزی سے نفرت کرتے تھے۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لیے سرسید احمد خان نے یہ تدبیر سوچی کہ نئے علوم و فنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے مسلمانوں میں ان کتابوں کی اشاعت کی جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان نئے علوم سے واقف ہونے لگیں گے اور دوسرے ان کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ انگریزی میں کیسی مفید اور کارآمد کتابیں ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ انگریزی سے ان کی نفرت کم ہونے لگے گی اور وہ اس زبان کو سیکھنے کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ اپنے اس خیال کے مطابق سرسید احمد خان نے ۱۸۸۲ء میں ایک تحریر التماس بخدمت ساکنانِ ہند در بابِ ترقی تعلیم اہل ہند کے عنوان سے شائع کی جس میں ایک ایسی مجلس قائم کرنے کی ضرورت بیان

کی جواپنے قدیم مصنفوں اورانگریزوں کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرے۔

مجلس کے مقاصداوراس کی ضرورت سے لوگوں کو بخوبی آگاہ کرنے کے بعدسرسیداحمدخان نے غازی پور میں سائنٹی فک سوسائٹی کے نام سے ایک مجلس قائم کی۔

☆ کالج کا قیام

ابتدائی مدرسہ قائم ہوجانے کے بعد پوری توجہ کالج کے قیام پر مرتکز ہوگئی۔سرسیداحمدخان پنشن لے کرعلی گڑھ آگئے اوروہاں مستقل سکونت اختیارکرلی۔اب سرسیداحمدخان نے اپنا تمام وقت اورتمام کوشیشیں اورصلاحیتیں کالج کے لیے وقف کردیں۔۸جنوری ۱۸۷۷ءکولارڈلٹن وائسرائے ہندنے کالج کا سنگ بنیادرکھا جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اوراردو میں مدرستہ العلوم تجویز کیا گیا تھا۔کالج کی عمارتوں کے بارے میں سرسیداحمدخان کا شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ تمام عمارتیں بہت خوش نمااورنہایت شاندارہوں تاکہ لوگوں پراس کا اچھااثر پڑےاورآئندہ نسلوں کواپنا ایک باعظمت ادارہ دیکھ کراس کوقائم رکھنےاورترقی دینے کا خیال پیداہو۔چنانچہ سرسیداحمدخان بہت شاندار عمارتیں بناونے لگےجن میں کالج کی متعددعمارتوں اوراقامت خانوں کےعلاوہ ایک بہت بڑی اورخوبصورت مسجد تعمیرکرنے کا منصوبہ بھی شامل تھااوران عمارتوں کے لیے روپیہ فراہم کرنے میں سرسیداحمدخان کو بے انتہا کوشش کرنی پڑی مگروہ اپنے مقصدمیں آخرکامیاب ہوئے۔

یکم جنوری ۱۸۷۸ءکوکالج کلاسوں کا آغاز ہوا۔اورمسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا نیادورشروع ہوگیا۔جیسا کہ سرسیداحمدخان کا خیال تھااس کالج میں تعلیم اورتربیت دونوں پہلوؤں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا۔نصابِ تعلیم میں جدیداورمفیدعلوم کوداخل کیا گیا۔اوراس کے ساتھ ہی مذہبی تعلیم کوبھی پوری اہمیت دی گئی۔طلباء کی تربیت میں اس بات کا خاص طور پرخیال رکھاجاتا تھا کہ وہ ذہنی اورجسمانی ہراعتبار سے پوری طرح صحت مندہوں اوران میں وہ خرابیاں باقی نہ رہیں جو ہندوستانی معاشرہ میں پیداہوگئی تھیں۔یہ خرابیاں دورکرنے کےعلاوہ اس تربیت کا مقصد طلباء میں وہ اوصاف پیداکرنا تھا۔جومعاشرہ کی بہتری اورملک وملت کی فلاح وترقی کے لیےضروری ہیں۔سرسید کی اس تعلیم وتربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے کالج کےطلباء نےتعلیم کی بخوبی تہذیب وشائستگی،رہنےسہنے کےطریقے ترقی پسندرجحانات،اچھےاخلاق،مضبوط کردار،دینی اخوت اورروشن خیالی کی وجہ سے رفتہ رفتہ امتیازی حیثیت حاصل کرلی۔سرسیداس کالج کو یونیورسٹی بنانے کا خیال رکھتے تھےجوان کی زندگی میں پورانہ ہوسکا۔لیکن ان کے بعداس

کالج نے مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلی اور نہ صرف اسلامی ہند بلکہ پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا ادارہ بن گئی۔

2.3.2 : سرسید احمد خان بحیثیت مفکر اعظم

انیسوی صدی کا عہد ہندوستان کی تاریخ میں کئی عبرت انگیز اور دلچسپ واقعات سے پر ہے۔ ۱۸۵۷ء کی خونی انقلاب نے سات سو سالہ تہذیب کا خاتمہ کردیا۔جسکی شان وشوکت کے نغمے پوری دنیا میں مقبول ومصروف تھے۔مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہند کی سرزمین میں ہندوستانی مسلمانوں کی سمت میں اماوس کی رات سے بھی زیادہ کالی اورڈراونی رات اوردن لکھ دی گئی تھیں۔اودھ کی دلکش شام اب ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک بند آنکھوں والی خواب تھی۔جیسے برطانوی حکومت نے اپنے ظالمانہ سفاکانہ پالیسی کے ذریعہ مسلمانوں قوم کو تباہ و برباد کردیا تھا۔ ایسے پرآشوب فضا میں روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی تھی۔ جسے پوری دنیا سرسید احمد خان کے نام سے جانتی ہے۔ سرسید احمد خان کا نام ادب تاریخ فلسفہ،سماجیات،سیاسات،ذہنی ومذہبی کتب کے اوراق میں سنہرے حروف سے لکھا جاتا ہے۔سرسید احمد خان نے اپنی پوری زندگی ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستانی معاشرے کے ترقی پر گامزن کے خواہش مندر ہے۔اپنی اس آرزو کو پائے تکمیل تک پہونچانے کے لیے کئی مشکلات و پریشانیوں کے سمندر کو عبور کیا۔دکھ ورسوائی کا ہار کو بھی خوشی خوشی قبول کیا۔طنزیہ جملے،فقرے کو بے حد خوش دلی کے ساتھ سنا۔لیکن اپنے مشن کو ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی سے کبھی بھی پیچے نہیں ہٹے۔ بلکہ مخالف سرسید احمد خان کی تحریک کے سامنے آتی گئی۔ تحریک پہلے سے زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتی چلی گئی۔سرسید احمد خان کے نزدیک قوم کی ترقی اور معاشرے کی اصلاح ایک عبادت تھی۔ایسے مفکر اعظم کے غیر معمولی خدمات ناقابل فراموش ہے۔

سرسید احمد خان بہت دوراندیش اور حقیقت پسند تھے اور انھوں نے اس بات کو پوری طرح محسوس کرلیا تھا کہ انگریزوں کے عہد حکومت میں مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی و معاشی مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے بلکہ ان کی دینی اور معاشرتی حالت بھی اس قدر بگڑ چکی ہے کہ اگر حالات کو سدھارنے اوران پر قابو پانے کی مناسب تدبیریں اختیار نہ کی گئیں تو اس ملک میں مسلمانوں اور اسلام دونوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔سرسید کا اصل مقصد ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا تحفظ کرنا تھا۔اوراس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو منصوبہ بنایا اور جو تحریک شروع کی وہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھی اور سیاست،معاشرت،معیشت،دین،اخلاق،تعلیم،ثقافت،غرض کہ زندگی

کے تمام اہم شعبوں کی اصلاح وترقی اس کے دائرہ عمل میں شامل تھی۔اس میں شک نہیں کہ یہ کام بہت بڑا اور بہت مشکل تھا اوراس قدر نا موافق حالات میں کامیابی کی امید بھی برائے نام تھی،لیکن سرسیداحمد خان بڑے باعزم و باہمت انسان تھے۔ وہ اپنے مقصد پر پوری ثابت قدمی سے اڑے رہے اور رفتہ رفتہ اپنی اصلاحی کوششوں کو ایک ملک گیرتحریک بنا کرحصولِ مقصد کی راہ ہموار کرلی۔

معاشری کی ہر جہتی،اصلاح وترقی کے لیےسرسیداحمد خان نے جومنصوبہ بنایا تھااس کوعملاً کامیاب بنانے کے لیےقوم میں ایک ذہنی وعملی انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت تھی،اور بہت غور وفکر کے بعدسرسیداحمد خان اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قوم میں یہ انقلاب اسی وقت ہوسکتا ہے جب نئی نسل کوصحیح قسم کی تعلیم دی جائے۔اس وقت ہندوستان میں قدیم اور جدید دونوں قسم کی تعلیم ناقص تھی۔اورمسلمانوں کوان دونوں سے نقصان پہنچ رہا تھا۔قدیم طرز کی تعلیم نئے حالات میں بالکل بے کار تھی۔اس سے زندگی کے مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہ ملتی تھی اورنتائج کے اعتبار سے یہ قوم کے لیے جہالت سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔اور جدید تعلیم میں بڑی خرابی یہ تھی کہ اس کا بنیادی مقصد انگریز حکمرانوں کے سامراجی مقاصد کوتقویت پہنچانا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس ملک میں لادینی تعلیم کا جونظام قائم کیا تھا اس کی برائیوں سے مسلمانوں کومحفوظ رکھنا بہت دشوار تھا۔اوراس تعلیم کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ تعلیم یافتہ مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت کوفراموش کردیں کہ وہ ایک درخشاں ترین ماضی اور ایک عظیم ترین روحانی واخلاقی تہذیب کے وارث ہیں اورانسان کےفکری وذہنی ارتقاء،علوم وفنون کےفروغ اورتہذیب وثقافت کی ترقی میں ان کے آباء و اجداد کے کارنامے بہت نمایاں اورامتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔اس کےعلاوہ لادینی تعلیم سے مسلمانوں کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان اسلام کے بنیادی مقاصداوراس کے اصول ونظریات کی حکمت و حقیقت سے آگاہ نہ ہوسکیں گے اور یہ لاعلمی ان لوگوں کے ذہن میں دینی صداقتوں کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کردے گی اوروہ مذہب کودنیاوی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ تصور کرنے لگیں گے۔

مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں کے لیے جدید تعلیم ہرلحاظ سے بہت مفید تھی اور وہ اس سے پورا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ چونکہ ہندو مذہب محض رسوم ورواج اورتوہمات کا مجموعہ ہےاورزندگی کے مقاصد ومسائل اورترقی پذیر معاشرہ کے تقاضوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اس لیے ہندوؤں کے مذہب اور لادینی تعلیم میں کوئی تصادم نہیں تھا۔ بلکہ مغرب کے نئے لادینی تصورات ہندو معاشرہ کی فلاح ونجات اوراصلاح وترقی کے لیے بہت ضروری اور مفید تھے۔اوران کواختیار کرکے ہندوقوم معاشری وقار حاصل کرسکتی تھی۔ چنانچہ ہندوؤں نے جدید تعلیم کواس بنا پرخوشی

سے قبول کرلیا تھا کہ یہ ان کی معاشی خوشحالی، معاشرتی اصلاح اور ذہنی تربیت کا نہایت موثر ذریعہ بن جائے گی اور مغربی نظریات ہندو معاشرہ کے بہت سے خلاؤں کو پُر کردیں گے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے جدید تعلیم کے ان متضاد نتائج نے بھی مسلمانوں کے سامنے ایک اہم مسئلہ پیش کردیا تھا۔ اور نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی اور معاشی مفاد کے لیے بھی اس کو حل کرنا ضروری تھا۔

سرسید احمد خان قدیم اور جدید دونوں قسم کی تعلیم کے تمام نقائص سے بخوبی واقف تھے اور اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ جدید تعلیم کا مقاطعہ کرکے مسلمان تعلیم میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اگر وہ نئے علوم وفنون سے اسی طرح غافل رہے تو ذہنی وعلمی ترقی، معاشی خوش حالی اور نئے معاشرہ میں باعزت وباوقار مرتبہ حاصل کرنے سے محروم رہیں گے اور ان کا مستقبل تاریک تر ہوجائے گا۔ ان تمام حالات کے پیش نظر سرسید اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ تمام جدید اور مفید علوم اور اس کے ساتھ ہی اسلام کی صحیح تعلیمات اور زندگی کے اعلیٰ اصول ومقاصد سے پوری طرح واقف ہوجائیں اور ملک اور معاشرہ کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق تمام اہم مسائل کو بخوبی حل کرسکیں۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم پر پوری توجہ کی اور اپنے مقاصد ونظریات کو عملی شکل دینے کے لیے علی گڑھ کالج قائم کردیا جو ان کی اصلاحی تحریک کا مرکز ومحور بن گیا۔

اس زمانے میں مسلمانوں کو جن خطرات کا سامنا تھا ان میں انگریز حکمرانوں کی سیاسی پالیسی بھی مسلمانوں کے حق میں بڑی تباہ کن تھی اور سرسید احمد خان کو اس مسئلہ پر بھی خاص توجہ کرنی پڑی۔ مسلمان اور انگریز دونوں ایک دوسرے سے بدگمان اور متنفر تھے اور انگریز مسلمانوں سے خائف تھے اور اپنی حکومت کے لیے ان کو بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔ انگریزوں کو یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پھر حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور سراج الدولہ، میر قاسم، حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے حریت پسندوں کی شدید مقاومت اور ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی زبردست جدوجہد کی بناء پر انگریز اپنے اس اندیشے کو ایک حقیقت سمجھنے لگا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو کمزور رکھنے کے لیے انھوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کرنے کی پالیسی اختیار کرلی تھی۔ یہ پالیسی مسلمانوں کے لیے اس وجہ سے اور زیادہ خطرناک تھی کی ہندوستان میں ہندو اکثریت میں تھے اور انگریز یہ چاہتے تھے کہ مغربی جمہوریت اور وطنی قومیت کے تصورات پر مبنی اکثریت کی حکومت کے نظریہ کو ہندوستان میں بھی بتدریج رد بہ عمل لایا جائے۔ انگریز حکمرانوں نے اپنی پالیسی میں اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کردیا تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ کئی قومیں آباد ہیں۔ اور ہندو اور مسلمان اکثریت اور اقلیت نہیں بلکہ جداگانہ قومیں ہیں۔ انگریز اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے

کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت چونکہ مذہب پر مبنی ہے اس لیے یہ دائمی اکثریت ہے۔اور اگر اس مذہبی اکثریت کوسیاسی اکثریت قرار دے کرحکومت اس کے حوالے کردی گئی تو یہ عمل جمہوریت اوراس کے اصول ومقاصد کے بالکل برعکس ہوگا اورایک دائمی اکثریت کی یہ حکومت جمہوری کے بجائے استعماری ہوگی۔لیکن انگریز اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت اورر ہندو اپنے مفاد کے پیش نظر اس غیر جمہوری طرز عمل کو جمہوری قرار دینے پر ہمیشہ اصرار کرتے رہے۔اپنی اس پالیسی کے مطابق انگریزوں نے ہندوستان کونئی قسم کے نظامِ حکومت سے آشنا کیا اورانڈین نیشنل کانگریس بھی قائم کی جس کی سرگرمیوں میں ہندو بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ ادارہ جمہوری اورقومی حقوق کا نام لے کر جو کچھ مانگ رہا ہے وہ اگر مل گیا تو اس سے صرف ہندو ہی فائدہ اٹھائیں گے اور ہندوستان کی دوسری قوموں پران کی بالادستی قائم ہوجائے گی۔

اس زمانے کے مسلمان جن کی قوم اقلیت میں ہونے کے باوجود اس ملک پر سیکڑوں سال تک حکومت کرچکی تھی،قدرتی طور پر نہ تو اکثریت کی حکومت کے نظریہ کو سمجھ سکتے تھے اور نہ مغربی نظامِ حکومت سے آشنا تھے۔اوران میں اتنا سیاسی شعور بھی نہ تھا کہ وہ انگریزوں کی اس پالیسی کے مضمرات سے آگاہ ہوسکے۔تاہم اس قوم میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جوغور وفکر کی صلاحیت اور سیاسی بصیرت رکھتے تھے،انگریزی نظامِ حکومت اور سیاسی پالیسی کے خطرناک نتائج کا صحیح اندازہ کرسکتے تھے۔اور یہ جانتے تھے کہ ایک قوم کے تصور پر مبنی جمہوری نظام مسلمانوں کے لیے نقصان رساں ہے۔یہی سبب ہے کہ سید امیر علی اور محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کے دوسرے رہنما مسلمانوں کی ایک الگ سیاسی جماعت قائم کرنا بہت ضروری خیال کرتے تھے اور سید امیر علی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کی شاخیں،ایک مرکزی کانفرنس منعقد کرکے مسلمانوں کے جداگانہ قوم ہونے کا اعلان کردیں اورانڈین نیشنل کانگریس اورانگریز دونوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو جداگانہ سیاسی ومعاشی حقوق دینے کا مطالبہ کریں۔

سرسید احمد خان انگریزوں سے تعاون اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔انگریزوں سے تعاون کی پالیسی پرتو وہ آخری دم تک کاربند رہے لیکن ہندو مسلم اتحاد کی تمام کوشیش ناکام ہوئیں اورآخر کار وہ بھی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اوران کے قومی حقوق کے تحفظ کی حمایت کرنے لگے۔اس میں شک نہیں کہ انگریزوں سے تعاون، مصالحت اور دوستی بڑھانے کی کوشش میں سرسید احمد خان انتہائی حدود سے بھی تجاوز کرگئے اورمخالفین نے ان پر انگریز پرستی کا الزام عائد کردیا لیکن یہ طرزِ عمل ان حالات اورواقعات کے منطقی نتیجہ تھا جو سرسید احمد خان کی نظروں

کے سامنے تھے۔سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور کے حالات اور ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کے نتائج دیکھ کر سرسیداحمدخان نے یہ رائے قائم کی تھی کہ ہندوستان کے زوال پذیر مسلمان انگریزوں جیسی ترقی یافتہ اور طاقتور قوم کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور اگر ان میں پھر تصادم ہوا تو اس ملک میں مسلمانوں کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ انگریزوں سے خوشگوار روابط قائم کریں اور ان کی حکومت سے جو فوائد حاصل ہوسکتے ہیں ان سے پوری طرح اور صحیح طور پر کام لے کر اپنی قوم کی اصلاح وترقی کے لیے کوشش کریں۔کیونکہ موجودہ حالات میں اس قوم کے لیے یہی سب سے اہم مسئلہ ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد واتفاق قائم رہنے کے امکانات سے سرسیداحمدخان اس لیے مایوس ہوگئے تھے کہ سیاسی حالات فرقہ واری تعصب کو ہوا دے رہے تھے۔ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے تھے۔مسلمانوں کے سیاسی ومعاشی حقوق،تہذیب وثقافت،قومی روایات اور اردو زبان کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ ہندوؤں نے معاندانہ روش اختیار کرلی تھی۔یہ حالت دیکھ کر سرسیداحمدخان کو یقین ہوگیا کہ اب دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی اور ان میں مخالفت وعناد روز بروز بڑھتا ہی جائے گا۔یہ دونوں قومیں اقتدار میں برابر کی حصہ دار نہ ہوسکیں گی بلکہ ایک قوم دوسری قوم پر مسلط ہونے کی کوشش کرے گی۔چنانچہ سرسیداحمدخان مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے جداگانہ کوششوں کو لازمی تصور کرنے لگے۔وہ یہ جانتے تھے کہ کانگریس جس قدر زیادہ طاقت حاصل کرے گی وہ مسلمانوں کے لیے اتنی ہی زیادہ نقصان رساں بن جائے گی۔اس لیے انھوں نے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کی مخالفت کی۔اور ایسی منظّم وموثر جدوجہد کرنے پر زور دیا جو تخریب وتصادم کے بجائے تعمیر و تعاون پر مبنی ہو اور مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت کرکے برطانوی نظامِ حکومت میں ایک باعزت قوم کی حیثیت حاصل کرلیں۔سیدامیرعلی اور سیداحمدخاں جیسے دوراندیش رہنماؤں نے حالات کا اندازہ کرکے جو رائے قائم کی تھی وہ درست ثابت ہوئی۔ہندوؤں کے طرزِعمل اور فرقہ واری تعصب نے قومی اتحاد کا رشتہ توڑ ڈالا۔اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے باعزت قومی وجود اور اپنے ملی حقوق کی حفاظت کے لیے اپنی ایک الگ سیاسی تنظیم قائم کرلی اور اس برعظیم میں مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا قیام ان کا ملی نصب العین بن گیا۔

ان تمام خطرات اور مشکلات کے علاوہ جو انگریزوں کی حکومت قائم ہوجانے کا نتیجہ تھے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ خود مسلمان اسلام کی صحیح تعلیمات سے بہت دور ہوگئے تھے۔اور غیراسلامی اثرات نے ان کے عقائد ونظریات اور دینی تصورات کو بری طرح مسخ کردیا تھا۔ہر زمانے میں وہی

نظریۂ حیات قابلِ قبول ہوتا ہے جواس زمانے کے اہم مسائل کوحل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہواور جن نظریات میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ زمانے کے تقاضوں کوان سے ہم آہنگ کیا جاسکے وہ نظریات یا تو ترک کردیے جاتے ہیں یا ان کواختیار کرنے والی قوم زوال وپستی کی تاریکیوں میں گم ہوجاتی ہے۔سرسیداحمدخان کے زمانے میں مسلمانوں کا تصورِمذہب نہایت محدود، جامداور روایتی ہوگیا تھااور وہ اس حقیقت کوبھول گئے تھے کہ اسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جوزندگی کے ہرشعبہ میں ان کی رہبری کرسکتا ہےاورایک ترقی پذیرانسانی معاشرے کے تقاضے ہرزمانے میں اسلام کی بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ ہوسکتے ہیں۔مسلمانوں کی اس گمراہی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے بگڑے ہوئے عقائداورنظریات کودرست کرنے کے بجائے اپنے غیراسلامی معتقدات، رسوم ورواج اورتوہمات کو برقراررکھنااور ان کی حفاظت کرنا اپنامذہبی فرض سمجھتے تھے۔ان کے اس طرزِعمل سے اسلام کے مخالفوں اورعیسائی مبلغوں کو، جو حکومت کی سرپرستی میں کام کررہے تھے، اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے وسیع مواقع مل گئے تھےاور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں یہ غلط خیال پھیلایا جارہا تھا کہ اسلام کے فرسودہ اصول موجودہ زمانے کے لیے بے کار ہیں اور معاشرہ کی فلاح وبہبوداورترقی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔اس پروپیگنڈہ نے قدرتی طور پرنوجوانوں کے تجسس پسندذہن میں اسلامی تعلیمات کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کردیے تھےاوراس بات کا امکان یقینی نظرآتا تھا کہ اگر ان شبہات کاتسلی بخش جواب دے کران کومطمئن نہ کیا گیاتو اسلام کی صحیح تعلیمات اوراس کے اصولوں کی حکمت سے ناواقف مسلمان بھی اپنے مذہب سے بدگمان ہونے لگیں گےاور یہ بدگمانی الحاد وارتداد کے دروازے کھول دے گی۔

مسلمانوں کے لیے یہ صورتِ حال سیاسی غلامی، معاشی تباہی، اورمعاشرتی پستی سے کم خطرناک اور بربادکن نہ تھی۔لیکن اس کونہ تو عام مسلمان محسوس کرتے تھےاور نہ مذہبی طبقہ میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ ایسے نازک وقت میں عوام کی صحیح رہبری کرسکتا۔اس لیے کہ مذہب کے معاملے میں یہ طبقہ نہایت تنگ نظراور جمود پسند تھااوراس کی دینی سرگرمیاں مناظرہ بازی اورکافرسازی تک محدودتھیں۔چونکہ یہ لوگ مذہب کی روح اوراس کے مقاصد سے ناآشنا اوراس کے اصولوں کی حکمت وافادیت سے بیگانہ تھےاس لیے وہ نہ تو دینی احکام ومسائل کوصحیح طور پر بیان کرسکتے تھےاور نہ مخالفوں کے اعتراضات کامعقول جواب دے سکتے تھے۔حالات کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کواسلام کی صحیح تعلیمات سے آگاہ کرکے ان کے بگڑے ہوئے عقائد درست کیے جائیں اوراسلام کے بنیادی اصولوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے دینی افکارونظریات کی اس طرح ازسرِنوتشکیل کی جائے کہ وہ نئے دور کے بدلے ہوئے

حالات میں زندگی کے اہم مسائل کوحل کرسکیں اورمعاشرہ کی ہرجہتی اصلاح وترقی میں مدد دیں۔اس اہم تقاضے کو سرسیداحمدخان نے پوری طرح محسوس کیااوراسلامی تعلیمات کی تشریح وتاویل کوبھی اپنی اصلاحی تحریک کاایک بنیادی مقصد بنالیا۔اس کوشش میں سرسیداحمدخان سے کچھ غلطیاں بھی ہوئیں اوران کی بعض تاویلوں سے اتفاق نہیں کیاجاسکتا۔لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں میں دینی شعور بیدارکرنے میں سرسیداحمدخان نے نمایاں حصہ لیاہےاوراسلامی افکارکی ازسرِنوتشکیل اوراسلامی نظریۂ حیات کی تجدید کے لیےاقبال نےمسلمانوں میں جوذہنی وفکری انقلاب پیداکردیااس کا آغازکرنے والوں میں سرسیداحمدخان کوبھی ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔

اس طرح مسلمانوں کی تعلیمی ترقی،ان کے ملی حقوق کا تحفظ اوراسلامی افکارکی تشکیلِ جدیدسرسید کی اصلاحی تحریک کے بنیادی مقاصد بن گئے۔اور چونکہ اردوزبان کوسرسیداحمدخان مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی اساس اورقومی اتحادکی ضمانت تصورکرتے تھےاس لیےاردوکی ترویج وترقی اورتحفظ کوبھی انھوں نے اپنی تحریک میں بہت نمایاں اہمیت دی اوراس کےمخالفوں کااس شدت سے مقابلہ کیا کہ آخرکاریہی مسئلہ ان کے سیاسی نظریات اورنصب العین میں تبدیلی کا باعث ہوا۔اس کےعلاوہ معاشرہ کی خرابیاں دورکرنے کے لیےسرسیداحمدخان رسوم ورواج اور طرزِمعاشرت میں اصلاح وترمیم اورعورتوں کےحقوق کی حفاظت کوبڑی اہمیت دیتے تھےاورقومی اتحادوملی استحکام کے لیے مذہبی رواداری اورمختلف فرقوں میں اتحادواتفاق کولازمی سمجھتے تھےاس لیےان مقاصد کےحصول پربھی انھوں نے پوری توجہ کی تاکہ ہرقسم کی خرابیاں دورکرکےایک ایساترقی پذیرمعاشرہ تعمیرکیاجاسکے جونئے دور کے تقاضوں سےہم آہنگ ہو۔غرض کہ سرسیداحمدخان کےپیش نظرمعاشرہ کی اصلاح وترقی کاایک ہمہ گیرمنصوبہ تھاجس کوعملی شکل دینے کے لیےانھوں نے ایک منظّم تحریک شروع کی تھی۔اوراس تحریک کومستحکم بنانے،آگے بڑھانے اور بدلے ہوئے حالات کےمطابق نئی نسل کوعمدہ تعلیم وتربیت دینے کے لیےانھوں نےعلی گڑھ میں جوکالج قائم کیاتھا وہی ان کی تمام جدوجہد کا مرکزبن گیا۔اس کالج نے آگے چل کرمسلم یونیورسٹی کی شکل اختیارکرلی اور جواہمیت، وقار،ناموری اورکامیابی اس یونیورسٹی نے حاصل کی وہ ہندوستان کی کسی اور یونیورسٹی کونصیب نہ ہوسکی۔

اس طرح علی گڑھ ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا مرکزبن گیااورسرسید کے زمانے سے لےکر۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام تک اس کی یہ مرکزی حیثیت برقرار رہی۔اوراس نصف صدی کے دوران میں معاشرتی اصلاح،تعلیمی ترقی اورملی وسیاسی بیداری کی جتنی تحریکیں رونما ہوئیں ان میں سرسیداحمدخان کا قائم کردہ ادارہ ہمیشہ

پیش پیش رہا اور اس نے چند ایسے عظیم رہنما پیدا کیے جنھوں نے نہ صرف اسلامی ہند بلکہ پورے ہندوستان کی قیادت کا فرض انجام دیا۔

سیاسی اعتبار سے سرسید احمد خان کی تحریک کے نتائج نہایت اہم اور دوررس ثابت ہوئے۔ اس کی بدولت مسلمانوں میں ملی وسیاسی شعور بیدار ہوگیا اور انھوں نے اپنے مستقبل کی تعمیر اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے سیاسی میدان میں بہت اہم اور فیصلہ کن قدم اُٹھائے۔ چنانچہ ملی مفاد اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے کل ہند مسلم لیگ قائم کی اور حکومت سے اپنے مطالبات منوانے لگے۔ انگریزوں کے زیر سایہ نام نہاد خودمختاری کے بجائے مکمل آزادی کو ہندوستان کا نصب العین قرار دیا اور اس کامیابی کے ساتھ پورے ملک کی قیادت کی کہ یہ تحریک ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی یہاں تک کہ انڈین نیشنل کانگریس اور ہندو رہنما بھی اس کو قبول کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا نظریہ پیش کر کے پورے ہندوستان پر فرقہ پرست ہندو اکثریت کی دائمی حکومت کا منصوبہ ناکام بنادیا اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ قومی مملکت کے قیام کی تحریک اس قدر جوش وخروش، عزم واستقلال اور نظم وضبط کے ساتھ چلائی کہ انگریزوں اور ہندوؤں کی شدید مخالفت اور مقاومت کے باوجود پاکستان قائم کرلیا۔

اس تحریک کو پھیلانے اور کامیاب بنانے کے لیے سرسید اور ان کے ہم سن اور نوعمر رفیقوں نے بڑی جدوجہد کی۔ ان لوگوں میں سید مہدی علی (محسن الملک) مشتاق حسین (وقار الملک) خواجہ الطاف حسین حالی، نذیر احمد، چراغ علی، سید حسین بلگرامی، نواب محمد اسحاق، برکت علی، نواب سلیم اللہ، سید محمود، شبلی نعمانی، عزیز مرزا اور شاہدین ہمایوں بہت ممتاز تھے جن کے عزم وعمل نے تحریک کی جڑیں مضبوط کردیں اور سرسید کو کوششیں بارآور ہوئیں۔ سرسید کے مقاصد کے حصول اور ان کی تحریک کے فروغ میں علی گڑھ کے طلباء نے خاص طور پر بہت نمایاں حصہ لیا اور اس جدوجہد کو روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری رکھا۔

درحقیقت ان طلباء ہی سے سرسید کی امیدیں وابستہ تھیں اور یہی ان کے خوابوں کو حقیقت میں بدل سکتے تھے۔ علی گڑھ کے طلباء نے بہت جلد زندگی کے مختلف شعبوں میں نام پیدا کرلیا اور نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ پورے ہندوستان میں انھوں نے عزت وشہرت اور نمایاں معاشرتی مرتبہ حاصل کیا۔ ان طلباء میں محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، ضیاء الدین اور آفتاب احمد خاں جیسے نامور سیاسی رہنما، ادیب وشاعر، صحافی، خطیب اور ماہر تعلیم پیدا ہوئے اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ سرسید کے اسی ادارہ نے آزادیِ کامل، خلافت اور ترک

موالات کی تحریکوں کے بانی و قائد پیدا کیے۔ اور یہیں سے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کو بھی کئی ممتاز رہنما اور ہزاروں مخلص کارکن ملے۔ چنانچہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے قائدین میں سے لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل خاں، چودھری خلیق الزماں، خواجہ ناظم الدین، اورنگ زیب خاں، عبدالرب نشتر، عبدالقیوم خاں، سکندر حیات، غلام بھیک نیرنگ، قاضی عیسیٰ، بندے علی تالپوری، اور افتخار حسین ممدوٹ اسی ادارہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس ملک کی حکومت اور اس کی ترقی و استحکام کی جدوجہد میں بھی ان لوگوں کی خدمات بہت نمایاں ہیں جو علی گڑھ کے فیض یافتہ اور قائداعظم کے رفیق و معاون تھے۔ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کی وفات اور ۱۹۵۸ء میں سیاسی انتشار کے باعث جب ملک وملت کو نازک ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا تو علی گڑھ ہی کے دو نامور فرزند لیاقت علی خاں اور محمد ایوب خاں پاکستان کے معمار و محافظ ثابت ہوئے اور ملک کو تباہ کن خطرات سے نجات دلا کر ترقی اور استحکام کی راہ ہموار کر دی۔

یہ تحریک سرسید کے رفیقوں اور علی گڑھ کے طلباء تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہندوستان کے وہ تمام مسلمان رہنما جو سیاسی فہم و بصیرت رکھتے تھے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی و سربلندی کے خواہاں تھے، سرسید کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوئے اور اس کی مکمل تائید کی۔ چنانچہ تحریکِ پاکستان کے تین عظیم ترین رہنماں، علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح اور قائد ملت بہادر یار جنگ کو سرسید کی تحریک اور مسلم یونیورسٹی سے نہایت گہرا اور قلبی تعلق تھا اور ملت کے درخشاں مستقبل کی تعمیر میں اس ادارہ کی اہمیت سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ سرسید کے ملی مقاصد کی تائید کرنے والے ان رہنماؤں میں آغا خاں، راجہ علی محمد خاں، ملا طاہر سیف الدین، مولانا عبدالباری، محمد سلیمان پھلواردی، نواب مزمل اللہ خاں، سید علی امام، سر عبدالرحیم، شیخ عبدالقادر، سر شاہ سلیمان، فضل الحق، عبداللہ ہارون، ملک برکت علی، محمد اسماعیل، راجہ صاحب محمود آباد، جمال میاں فرنگی محل اور بھی کئی شامل ہیں جنکی ملی خدمات سے اس تحریک کی ترقی و کامیابی میں بڑی مدد ملی۔

مسلمانوں کے لیے سرسید کی اصلاحی تحریک کس قدر ضروری اور مفید تھی اور انھوں نے ایک زوال پذیر معاشرہ کی ہر جہتی اصلاح و ترقی کا مشکل کام کس خوبی سے انجام دیا اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ ایک ایسی قوم جو معاشری، سیاسی، اقتصادی ہر اعتبار سے تباہ ہوگئی تھی۔ جو ایک بہت بڑے ملک پر صدیوں حکومت کرنے کے بعد غلام بنالی گئی تھی اور حکمرانوں کے بغض و عناد کا شکار تھی۔ جس کی اقتصادی زبوں حالی اور افلاس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جو زندگی کے ہر شعبہ میں نہایت پست حالت میں تھی۔ جس کے

رسوم ورواج ،اخلاق وکرداراورعادات واطوار بگڑ چکے تھےاورجس کی دینی زندگی میں بے شمارخرابیاں پیدا ہوگئی تھیں جونیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوکر جہالت کی تاریکی اور گمراہ کن تعلیم کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی ،اس کی حالت کو درست کرنا کس قدر مشکل تھا۔لیکن سرسید نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیااورجس ایمان وایقان ،خلوص وصداقت ،عزم وہمت ،فہم وفراست ،مستقل مزاجی اور کامیابی کے ساتھ انھوں نے یہ زبردست کام انجام دیاوہ ان کے افکارونظریات میں چندنقائص کے باوجودان کی عظمت کا ناقابلِ انکارثبوت ہے۔

2.4 : خلاصہ

سرسیداحمدخاں کی ذات کسی تعارف کےمحتاج نہیں ہے۔ان کی زندگی کا ہر پہلو ملک وقوم ومعاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئےمخصوص تھا۔سرسید کے نزدیک تعلیم کے ذریعہ ہی معاشرے میں انقلاب آسکتا ہے۔یہی وجہ ھکہ وہ اپنی تقاریراورتحریروں کے ذریعہ ہمیشہ یہ باورکیا ہے۔کہ ایک علیگ ومفکر وہ ہوگا جس کے دائیں ہاتھ میں فلسفہ اور بائیں ہاتھ میں سائنس اورٹیکنالوجی اورسر پرکلمہ طیبہ کا تاج ہوگا۔دراصل سرسیداحمدخاں مسلمانوں کوجدیدتعلیم کے ساتھ دینی علوم سے بھی آراستہ کرانا چاہتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ انسان کو لئے دونوں ضروری ہیں یہ ایک ہی سکہ کے دو پہلوں ہیں۔دراصل سرسیداحمدخان ایک عظیم اعلیٰ سوشل ریفرمر کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مفکر بھی تھے۔ان کی تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمان قدامت پرستی کے اندھیروں سے باہر نکلے۔آزادی فکراورذہنی بیداری سے دورجدید کے تقاضوں کوسمجھ کرترقی کی راہوں پرآگے بڑھتے جائیں۔اگرہندوستانی مسلمان آزادی فکر سے کام نہیں لیں گےتوایک مہذب شہری یامہذب زندگی بسرنہیں کرپائیں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سرسید کی دوررس نگاہوں نے اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ موجودہ دوراورآئندہ وقت میں مسلمانوں کی ترقی کا راز''تعلیمی بیداری'' میں پوشیدہ ہے۔انھوں نے سرسیدتحریک کے ذریعےمسلمانوں کواحیا اورذہنی بیداری کا پیغام دیا تھا۔تاکہ وہ پرانے فرسودہ خیالات ،توہم پرستی اوراندھی تقلید سے باہرنکلیں۔روشنی کے جانب اپنا قدم بڑھاتے جائیں۔یعنی سرسیداحمدخان کی وطنی وقومی خدمات نے ہی ہندوستانی مسلمانوں کوعالمی سطح پرایک شناخت بنانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔

2.5 : نمونے کےامتحانی سوالات

ا۔ سرسیداحمدخان کی معاشرہ اصلاح کے منصوبے پراپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۲۔ سرسیداحمدخان کے معاشری اصلاح کا خاکہ کا غیر جائزہ لیجیے۔

۳۔ سرسیداحمدخان کی اصلاح اورترقی پرایک نوٹ لکھئے۔

۴۔ سرسیداحمدخان بحیثیت مفکراعظم کا جائزہ لیجیے۔

2.6 : فرہنگ

الفاظ	معنی
منصوبہ بندی	غوروفکر کے بعدلائحہ عمل مرتب کرنا
متقدمین	آگئے بڑھنے والے
عقائد	عقیدہ
مدارس	تعلیم گاہیں
مفید	فائدہ
مفکر	فکر / سوچنا
تنظیم	انجمن / جماعت
تشکیل	خاکہ بنایا
سیاسی بیداری	شہری حقوق کے حصول کا احساس
نتائج افکار	تخلیقات

2.7 : سفارش کردہ کتابیں

۱۔	انتخاب مضامین سرسید	انورصدیقی
۲۔	تاریخ ادب اردو (جلد چہارم)	جمیل جالبی
۳۔	حیات جاوید	الطاف حسین حالی
۴۔	نذرِسرسید	توصیف بریلوی
۵۔	مطالعہ سرسیداحمدخان	پروفیسرعبدالحق

☆☆☆

باب : سوم

سرسید احمد خان بحیثیت مورخ اور صحافی

اکائی کے اجزاء

3.1 مقاصد
3.2 تمہید
3.3 موضوع کی وضاحت
3.3.1 سرسید احمد خان بحیثیت مورخ
3.3.2 جام جم
3.3.3 جلاء القلوب بذکر الجواب
3.3.4 آثار الصنادید
3.3.5 تاریخ ضلع بجنور
3.3.6 آئین اکبری
3.3.7 تاریخ سرکشی
3.3.8 توزک جہانگیری
3.3.9 تاریخ فیروز شاہی
3.4 سرسید احمد خاں بحیثیت صحافی
3.4.1 صحافت کی تعریف
3.4.2 اردو صحافت
3.5 خلاصہ
3.6 نمونے کے امتحانی سوالات
3.7 فرہنگ
3.8 سفارش کردہ کتابیں

3.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔

۱۔ سرسیداحمدخان کے تحریر کردہ تواریخ کتب سے واقف ہوسکیں گے۔

۲۔ سرسیداحمدخان کے تحقیقی تنقیدی مطالعہ سے واقف ہوسکیں گے۔

۳۔ سرسیداحمدخان کی صحافتی سفر سے واقف ہوسکیں گے۔

۴۔ اردوصحافت کی تاریخ سے واقف ہوسکے گے۔

3.2 تمہید

سرسیداحمدخان کا شمار ہندوستان کی ان عظیم اورممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کا نام ان کے وقار، تمکنت، علم و ادب میں سربلندی، سیاست وفراست اور مصلح قوم کی وجہ سے صفحہ تاریخ پر ہمیشہ درخشاں ستارے کی مانند چمکتا رہے گا۔جنہوں نے وقت کے ہاتھوں ایک تہذیب کو ابھرتے ہوئے دیکھا تو دوسری تہذیب کو مٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ سرسیداحمدخان اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔انکی تصانیفات میں اخلاقیات، مذہب، فلسفہ، اورتہذیب وتمدن کے نت نئے رنگوں سے اردو زبان روشناس ہوئی ہے۔اس کے علاوہ انکی تاریخ نویسی کے فن سے بھی زبان وادب نے ایک نیا فن سے روبرو ہوا تھا۔فن تاریخ کے میدان میں انکی تصانیف منفرد شناخت رکھتی ہے۔خاص طور سے جنوبی ایشیاء کی روایتی تاریخ کو ایک نئی جہات سے آشنا ہوا تھا۔انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اسلامی حکومت خصوصاً ہندوستان کی سرزمین میں مسلم حکمراں کی تاریخ قابلِ مطالعہ ہے۔

3.3 : موضوع کی وضاحت

3.3.1 : سرسیداحمدخان بحیثیت مورخ

سرسیداحمدخان کی تصانیفات میں تاریخ کی کتب منفرد معتبر حیثیت رکھتی ہے۔انیسوی صدی کے روشن خیال طبقہ میں سرسیداحمدخان کی تاریخی شعور کو بڑے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔تحقیق کے میدان میں بھی انکی تاریخ کتب مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ذیل میں سرسیداحمدخان کی تاریخ کے موضوع پر تحریریں کو یوں پیش کیا گیا ہے۔

3.3.2 : جام جم

سرسیداحمدخان نے تاریخ ہند کے موضوع پر سب سے پہلے ۱۸۴۰ء میں ''جام جم'' کو فارسی زبان میں مرتب کیا تھا۔اس کے مشمولات میں مقدمہ کے علاوہ سلاطین دہلی کے آباء واجداد کے اسماران میں سے ہرایک کی تاریخِ پیدائش وتخت نشینی اوران کے دورِحکومت کی مدت اور مقامِ تخت نشینی پرتفصیلات سے مع تاریخی جدول روشنی ڈالی گئی ہے۔اس جدول کی ابتداء، امیر تیمور سے ہوتی ہے۔جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دہلی میں پندرہ روز تک قیام پذیر رہے تھے۔سرسیداحمدخان نے اپنی تصنیف میں مختلف سلاطین کی ماؤں کے ناموں کے علاوہ شیرشاہ سوری (دورِ حکومت ۴۵۔۱۵۴۵) کی تاریخ پیدائش کا ذکر کیا ہے چونکہ تاریخ کی کتب میں شیرشاہ سوری کی پیدائش پراختلاف پایا جاتا تھا۔لیکن سرسیداحمدخان کی تاریخی شعوراور تحقیقی جستجو کی بناء پرصحیح سنہ پیدائش معلوم ہوا ہے۔ بقول اقتدار حسین صدیقی شاید سرسیداحمدخان پہلے مورخ ہیں جنہوں نے شیرشاہ سوری کے ان سکوں تک رسائی حاصل کی اور جدید تاریخ نگاری کے لیے علم مسکوقات (سکوں کے متعلق علم) یعنی سکوں کو بطور ثبوت استعمال کیا۔یہ جدول بادشاہ کی تخت نشینی کی طرح سکوں اوران کے ڈھالے جانے کی وضاحت کرتی ہے جسکی وجہ سے اس کام کی تاریخی قدر و قیمت مزید بڑھ جاتی ہے۔ان کی یہ تصنیف بنیادی اہمیت کی یوں حامل ہے کہ ہندوستانی تاریخ نگاری کے ضمن میں کی جانے والی پہلی کوشش ہے تاکہ فن تاریخ کوایک بنیادی فراہم کی جاسکے۔جس سے آنے والی نسلیں فائدہ اُٹھاسکیں، کیونکہ فنِ تاریخ، مورخین کوقوم/معاشرہ کی تاریخ میں ہونے والی تبدیلیوں اورتسلسل کے عناصر کے متعلق صحیح ادراہم وفہم فراہم کرتا ہے۔'' (۲۵۲)

تاریخی حوالے کی روشنی سے ''جام جم'' کا مقدمہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس تصنیف کے ذریعہ مصنف کے خاندانی پس منظر کا علم بھی براہِ راست ملتا ہے۔کہ انکے آباء واجداد کی مغل دربار سے وابستگی بھی بڑی تفصیل کے ساتھ ملتی ہے۔اکبر کے عہد میں ۱۶۰۵۔۱۵۵۶) ہندوستان تشریف لائے تھے۔جام جم کے مقدمہ میں مسٹر ہملٹن کے تعریفی وتوصیفی کلمات بھی مذکور ہیں۔سرسیداحمدخان کی تصنیف جام جم تاریخی کتب کے زمرے میں معیاری حیثیت رکھتی ہے۔

3.3.3 جلاءالقلوب بذکرالجواب

سرسیداحمدخان نے ہمارے پیارے نبی کی سیرت مبارکہ پرایک عمدہ تحریر قلم بند کیا۔۱۸۴۳ء میں جلاءالقلوب

بذکرالجوب کے نام سے شائع ہوا تھا۔اس کا مطالعہ کافی دلچسپ ہے۔کیونکہ اس کتاب میں اسلامی تاریخ پر تفصیل کے ساتھ بحث ملتی ہے۔اس کتاب میں تاریخ نگاری کی روایتی انداز سے گریز کیا گیا ہے۔دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ سرسیداحمدخان کی تصنیف ''جام جم'' میں روایتی اندازِ بیان ملتی ہے لیکن ''جلاءالقلوب بذکرالجواب'' میں تاریخی حوالے کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔دراصل جلاءالقلوب بذکرالجواب'' یہ مولودشریف ہے۔جومحفل میلاد میں پڑھنے کے لیے قلم بند کیا گیا ہے۔جس میں معتبر ومستند روایات کو بیان کیا گیا ہے۔سرسیداحمدخان کے تاریخی شعور کی پختگی کے سفر میں اسلامی تاریخ پر بڑی کڑی نگاہ تھی۔۱۸۷۰ء میں انہوں نے اپنی انگریزی کتاب Essay on the life of Mohammad یا اس کے اردو ترجمہ ''خطباتِ احمدیہ'' میں شواہد ودلیل سائنٹفک انداز سے ملتی ہے۔اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لندن کے مخطوطات کے علاوہ سیرت کے ان عربی مصادر سے بھی استفادہ کیا تھا جو عرب ممالک میں چھپ کر منظر عام پر آگئے تھے۔خطبات احمدیہ بنیادی طور پر سرولیم میور کی مناظرانہ کتاب Life of Mohammad کی تردید میں لکھی گئی تھی۔

3.3.4 : آثارالصنادید

یہ سرسیداحمدخان کی ایک اچھوتی اور شاہ کار تصنیف ہے۔جو پہلی بار ''مطبع سیدالاخبار'' سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔۱۸۴۷ء کا یہ ایڈیشن چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول:

شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں لکھا گیا ہے جس میں کتبے اور نقشے بھی شامل ہیں۔اور ۱۳۵ عمارتوں کے بیان پر مشتمل ہے۔

باب دوم:

قلعہ معلّٰی کی عمارت کے حال میں لکھا گیا ہے۔جس میں ۳۹ عمارتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔اس میں بھی نقشے اور کتبے شامل ہیں۔

باب سوم:

میں حال خاص شہر شاہجہاں آباد کو موضوعِ بیان بنایا گیا ہے جس میں شہر پناہ، دروازے کھڑکیوں، حال آبادی، شہر، مسجد جہاں نما (جامع مسجد) کتبوں، موضوع، حویلیوں، مکانوں، مزاروں، بھبتوں، درگاہوں،

مسجدوں، بازاروں، مدرسوں، مندروں اور گرجا گھروں وغیرہ کا حال شامل ہے۔

باب چہارم

دلی اور دلی کے لوگوں کے بیان پر مشتمل ہے جس میں نہ صرف دلی اور اس کی عمارتوں مثلاً قلعہ رائے۔قصر سفیہ، ہزار ستون، کوئلہ فیروز شاہ، تغلق آباد وغیرہ کا حال قلم بند کیا ہے بلکہ دلی اور شاہ جہاں آباد کی مختصر تاریخ بھی درج کی ہے۔اور ساتھ ہی وہاں کی آب وہوا اور زبان کے بارے میں بھی لکھا ہے۔اس باب میں نامور مشائخین، رسول شاہیوں، مجذوبوں، حکماء علمائے دین قراء وحفاظ، شعرائے کرام، خوش نویسوں، مصوروں اور اربابِ موسیقی کا حال درج کیا ہے۔جنکی کل تعداد ۱۲۸ ہے۔اس سے دلی کی ایک خوبصورت اور رونق افزاء تصویر اجاگر ہوتی ہے۔

اردو زبان میں یہ کتاب تاریخ نگاری کی جدید کاوز اور ابتدائے دورِ جدید قرار دی جاتی ہے۔''آثار الصنادید'' نے عہد وسطیٰ کی ہند مسلم تاریخ نگاری کو نئی جہات سے آشنا کیا۔اس کتاب کے گہرے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ سرسید احمد خان ماضی کی زندگی اور تہذیب کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے آثار قدیمہ کی بحیثیت ماخذ اہمیت سے واقف بھی تھے اور قائل بھی۔انہوں نے اس بات کا بھرپور احساس تھا کہ کوئی اہم شہر اپنے باشندوں کی ثقافت اور ان کی روایات کی تبدیلی میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔بحیثیت ایک دہلوی کے وہ اپنے شہر کی عظمت رفتہ کے تذکرہ پر نازاں تھے لیکن اس میں حسرت اور بارش بخیر کی تلخی کی جھلک نہیں ہے۔وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ قوموں کی طرح بڑے بڑے شہر بھی وقت گذرنے کے ساتھ اپنی تہذیب وتمدن اور اجتماعی روایات کو پروان چڑھاتے ہیں۔سلاطین دہلی کے زیر سایہ جیسے وسیع الجہات شہر کی اس کایا پلٹ کرنے والے اثرات نے زندگی، زبان اور تہذیب وتمدن پر کافی اثر ڈالا۔یہ اثرات صرف آس پاس کے علاقوں پر ہی نہیں مرتب ہوئے بلکہ اس کے اثرات دور دراز علاقوں تک پہنچے جو کافی اہمیت کے حامل ہیں۔بقول ان کے کسی تہذیب کی قسمت کا عکس بالآخر اس سے وابستہ اہم شہروں کی قسمت پر پڑتا ہے۔ بقول سرسید احمد خان جو تیرھویں صدی سے لیکر اٹھارویں صدی تک مطلق العنان اور عظیم سلاطین کی راجدھانی رہنے کی وجہ سے اپنے دامن میں ایک مسحور کن تاریخ سمیٹے ہوئی تھی۔اٹھارویں صدی میں مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ تنزل وانحطاط کا شکار ہوگئی۔انہوں نے حکمرانوں، ان کی نسلوں، قرونِ وسطیٰ کی دہلی کے فیماندہ آثار، اہم معاصر اہل علم اور مذہبی امور کا ایک تجزیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

انہوں نے اپنے دائرہ کار کو مزید وسیع کرتے ہوئے اس میں ترتیب کے ساتھ ان اشخاص کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اٹھارویں صدی کے نصف آخر تک مختلف فنون اور حرفت کے میدان میں نمایاں شہرت حاصل کر چکے تھے تا کہ دہلوی تہذیب وتمدن کی ایک جھلک دکھا سکیں۔ اس تذکرہ کے بغیر دہلی کی ثقافت کی بھرپور جھلک نہیں دکھائی جاسکتی ہے۔

3.3.5 : تاریخ ضلع بجنور

۱۲/ جون ۱۸۵۵ء کو سرسید احمد خان دلی سے بجنور تبدیل کر دئے گئے تھے۔ یہاں پر مستقل صدر امین کی حیثیت سے فائض تھے۔ اپنے اس قیام سفر میں حکومت کے ایما پر تاریخ ضلع بجنور تحریر کی۔ تحریر یہ تصنیف ۱۸۸۷ء کی بغاوت کی نذر ہوگئی تھی۔

3.3.6 : آئین اکبری

ابوالفضل کی تصنیف آئین اکبری کو سرسید احمد خان نے مختلف نسخوں کے مقابلہ کر کے مرتب کیا ہے۔ کہ مغلیہ سلطنت کی تاریخ کو سمجھنے میں بہ آسانی ہوسکیں۔ حالی نے اس کی تفصیل ''حیات جاوید'' میں درج کی ہے۔ یہ تین جلدوں میں شائع ہونے والی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کی شورش میں دوسری جلد تلف ہوگئی ہے۔ صرف جلد اول اور سوم کے نسخے دستیاب ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئیں ہیں۔

3.3.7 : تاریخ سرکشی بجنور

اپریل ۱۸۵۸ء میں سرسید احمد خان کا تبادلہ بجنور سے مرادآباد ہوگیا تھا۔ مرادآباد میں سرسید احمد خان نے تاریخ سرکشی بجنور کو قلم بند کیا تھا۔ اس کتاب میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے سیاسی و تاریخی حالات و واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ جو ضلع بجنور میں پیش آیا تھا۔ یہ کتاب ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ تاریخی نقطہ نگاہ سے یہ کتاب ہندوستان کی سیاسی زندگی کو سمجھنے میں بڑی معاون ہے۔

3.3.8 : توزک جہانگیری

سرسید احمد خان کو اسلامی تاریخ سے بے حد دلچسپی تھی انکی تصنیفات میں تاریخ کے کتب بڑی مرکزیت رکھتی

ہے۔ جب سرسیداحمدخان کا تبادلہ غازی میں ہوا تھا۔تو وہیں انہوں نے اپنی نجی پریس سے۱۸۶۳ء میں مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر کا روزنامچہ ''توزک جہانگیری'' میرزامحمد ہادی کے فارسی دیباچہ کے ساتھ شائع کیا۔

3.3.9 : تاریخ فیروزشاہی

مرادآباد کے زمانہ قیام میں سرسیداحمدخان نے ضیاءالدین برنی کے مشہورتاریخ ''تاریخ فیروزشاہی'' کی چار مختلف نسخوں کی مدد سے تصحیح وتدوین کی جسے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے۱۸۶۳ء میں شائع کیا۔اس کا دیباچہ۱۸۶۱ء میں لکھااور پھروہی دیباچہ اخبارسائنٹفک سوسائٹی جلدایک شمارہ۲۲بابت۲۴/اگست۱۸۶۶ء میں بھی شائع کیا۔

سرسید احمد خان کی شخصیت اپنی ذات میں ایک ایسی انجمن تھی جسکی روشنی میں ادب سے تاریخ اوراق منورہوئے ہیں انکی تاریخ نگاری سے غیرمعمولی دلچسپی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ انکا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ انہوں نے جن موضوعات پر بھی قلم اُٹھایااس موضوع کا حق ادا کردیا۔مختصرسرسیداحمدخان کی شخصیت بڑی پہلودار رہی ہے۔انکا بحیثیت مورخ بھی ایک اہم پہلو ہے۔

3.4 : سرسیداحمدخان بحیثیت صحافی

سرسیداحمدخان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔وہ اعلیٰ ذہنیت کے مطالک تھے۔انکی علمی وادبی خدمات کا اعتراف ادیبوں، دانشوروں نے اپنے منفرد انداز سے کیا ہے۔ وہ بیک وقت علم داں،صحافی، ماہر اقتصادیات، ماہرمحقق، قاید،مورخ اور نہ جانے کتنے علوم وفنون پر انکی دستگاہ تھی۔انکی علمی وقومی خدمات نے معاشرےاورقوم کی مستقبل کوسنوارا ہے۔سرسیداحمدخان ایک ایسی ہستی تھی جنکی زندگی کا اولین مقصداپنےقوم کے لیے جینااورمرنا تھا۔ایسی مثال دنیامیں کم نظرآتی ہے۔اس باب میں سرسیداحمدخان کی صحافتی خدمات پرتفصیل سے روشنی ڈالی جائیں گی۔

3.4.1 : صحافت کی تعریف

لفظ صحافت صحیفہ سے نکلا ہے۔صحیفہ کا لغوی معنی کتاب یارسالے کے ہیں۔صحیفہ سے مرادایک ایسا جریدہ جو خاص وقفہ پرنکلتا ہو۔اس سے صاف ظاہرہوتا ہے کہ تمام اخبارات، رسائل اور جرائد،صحیفہ کے زمرے میں آتے ہیں۔صحافت ایک ایسافن ہےجن میں تخلیقی قوتوں کےاستعمال سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

3.4.2 اردوصحافت

ہندوستان میں اردوصحافت کا باضابطہ آغاز۱۸۲۲ء سے ہوا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل ہندوستان میں فارسی صحافت کا رواج تھا۔لیکن کلکتہ کی سرزمین سے اردو کے افق پر ایک تابندہ تارا''جام جہاں نما'' طلوع ہوا۔''جام جہاں نما'' اردو کا اولین مطبوعہ اخبار ہے۔ جو۲۷/ مارچ ۱۸۳۳ء کوکلکتہ سے جاری ہوا تھا۔اس اخبار کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ لعل اور مالک ہری ہروت تھے۔ یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا۔ یہ اخبار فارسی ٹائپ میں چھپتا تھا۔ چونکہ اس وقت فارسی ٹائپ کا ہی رواج تھا اس اخبار کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ اردو کا پہلا اخبار تھا۔۱۸۵۷ء سے قبل ہندوستان کے مختلف شہروں سے متعدد اردو اخبارات جاری ہوئے تھے۔۱۸۳۴ء ممبئی سے''آئینہ سکندری'' یہ اخبار ۱۸۲۲ء سے ہی جاری تھا۔ یہ ایک نیم سرکاری اخبار اور ممبئی کے گورنر کی ایما پر جاری ہوا تھا۔انیسوی صدی میں جو سب سے بڑا اردو اخبار سامنے آیا وہ''دلی اردو اخبار'' تھا۔اردو کے مشہور و معروف ادیب مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اپنے عہد کی عکاسی کرتا تھا۔ جدوجہد آزادی میں مولوی محمد باقر کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔اردو کے پہلے شہید صحافی کے طور پر آپکو موسوم کیا جاتا ہے۔مولوی محمد باقر کا اپنا ایک چھاپا خانہ اور ایک بڑی لائبریری بھی تھی۔ جو۱۸۵۷ء کی لڑائی میں تباہ ہوگئی۔لیکن''دلی اردو اخبار'' نے ایک تاریخ ضرور مثبت کردی۔ ۱۸۳۷ء میں مرزا پور اتر پردیش سے ایک اخبار''خیر خواہ ہند'' جاری ہوا۔ایک مذہبی اخبار تھا۔ جسے ایک پادری نے جاری کیا تھا۔اس اخبار کا مقصد عسائیت کا مبلغ تھا۔ ۱۸۴۱ء میں دہلی سے''سید الاخبار'' جاری ہوا۔ جسے مصلح قوم سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمود نے جاری کیا تھا۔

جام جہاں نما سے لے کر آج کے اردو اخباروں تک اردو صحافت نے ترقی کے کئی مدارج طے کئے ہیں۔لیکن گزٹ نے اردو صحافت میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر اردو صحافت کے مورخ کے لیے ناگریز ہوگا۔ یہی وہ خبار ہے جس نے صحافت کو آزادی رائے، سنجیدگی، متانت اور صحتِ واقعات کی خوبیوں سے نوازا اور باوقار صحافت کی بنیاد ڈالی۔اس نے اردو زبان کا مزاج بدلنے اور خصوصاً اردو نثر کی صلاحیتوں اور امکانات کو واضح کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔اور جدید تعلیم کو فروغ دینے معاشرے کو''پدرم سلطان بود'' کی مستی سے ہوشیار کرنے میں تحقیق و احتساب اور حقیقت پسندی کا جذبہ پیدا کرنے میں گراں قدر حصہ لیا۔اس اخبار کے ذریعہ بڑے پیمانے پر بیرونی ملکوں اور وہاں کے باشندوں کے رہن سہن اور طرز معاشرت سے اردو داں طبقے کو واقفیت حاصل ہوئی۔انگریزوں

اور ہندوستانیوں میں جو منافرت کے جذبات تھے۔ وہ ایک حد تک کم ہوئے۔ یہی وہ نظریاتی اخبار ہے جس کے مقاصد کو بڑے پیمانے پر قبولیت حاصل ہوئی۔ اس اخبار نے ادیبوں کی تربیت کی جن کے کارناموں کی یاد ہمارے ادب کی منزل مقصود ہے۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جس نے اس اخبار کو ایک بڑے حلقے کا ممدوح بنادیا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں عموماً اور شمالی ہند میں خصوصاً ایک علمی فضا بنانے میں مددگار رہوا۔ بقول اکبرآبادی:

سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے۔ سرسید احمد خان نے بحیثیت صحافی ''سیدالاخبار'' میں لکھنا شروع کیا۔ اس کا اجراء ان کے بڑے بھائی سید محمد کی زیرادارت لیتھوگرلنک پریس دہلی سے ہوا۔ انہوں نے یہ مطبع اسی سال ۱۸۴۱ء میں قائم اور طباعت سید عبدالغفور کے ذمے تھی بڑے بھائی کے مرنے کے بعد سرسید احمد خان نے ۱۸۴۶ء میں اس کا نام ''مطبع سیدالاخبار'' رکھدیا اور وہ اس میں برابر مضامین لکھتے رہے مگر پھر ۱۸۴۹ء میں اسے مالی دشواریوں کی وجہ سے بند کرنا پڑا اور پریس بھی بک گیا۔ لیکن انہوں نے طباعت واشاعت کے کاموں سے جوڑے رہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو صحافت میں حقیقت نگاری اور بے خوف اندازِ تحریر سے پر نظر آنے لگی۔ اس کی تصویر محمد حسین آزاد نے اپنی نظم ''تاریخ انقلاب افزاء'' میں دہلی اخبار ۲۴ رمئی ۱۸۵۷ء میں یوں کھینچی ہے۔

کیا کہیے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے
حیران ہیں سب آئینہ صفت پشت بہ دیوار
حکم نصاریٰ کا بدین دانش و بنیش
مٹ جائے نشان حلق میں اسی طرح سے یکبار

رفتہ رفتہ صحافیوں میں حق گوئی اور اخلاقی جرات پیدا ہونے لگی۔ اخباروں کا معیار بہتر ہونے لگا۔ نیز اخبارات کی پالیسی بھی واضح ہونے لگی اور تبصرے بھی ہونے لگا۔ نیز اخبارات کی پالیسی بھی واضح ہونے لگی اور تبصرے بھی ہونے لگے۔ سرسید احمد خان نے ۱۸۶۶ء اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا تھا۔ یعنی اردو صحافت ایک نئے موڑ سے روبرو ہوئی تھی۔ اس میں خبریں انگریزی اخباروں جیسے لندن نیوز، ادور لینڈ میل، انگلش میل، کوارنر ریویو وغیرہ سے ترجمہ کرکے چھاپی جاتی تھیں۔ اور تار برقی کی خبریں کے زیرعنوان باہر کے ملک کی اطلاعات درج

کی جاتی تھیں اور حالاتِ حاضرہ پر بے باک تبصرہ کیا جاتا تھا۔سرسید احمد خان نے اپنے ایک مضمون ''اخبار کیسے ہونے چاہیے۔''میں لکھا ہیں:

''کہتے ہیں کہ اخبار ایک نہایت عمدہ ذریعہ قومی ترقی ،ملکی بھائی ،عوام کی رہنمائی ،خواص کی دلچسپی ، حکام کی ہدایت اور رعایا کی اطاعات کا ہے۔مگر اس کے دوسرے پہلو پر نظر کمتر کی جاتی ہے۔اخبار جیسا ذریعہ ان بھلائیوں کا ہے ویسا ہی ذریعہ بہت سی برائیوں کا بھی ہے۔ بلکہ افسوس ہے کہ ہمارا ملک ابھی پہلی قسم کے اخباروں کا نہایت محتاج ہے۔ایسے اخباروں کی کمی سے اور زیادہ تر اخباروں کے پڑھنے لکھنے والوں کے نہ ہونے سے ملک میں جہالت اور ناخواندگی اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ کسی شہر و قصبہ میں فیصد پانچ آدمی بھی اخبار پڑھنے کے لائق نہ نکلیں گے اور جو نکلیں گے وہ اخبارات پڑھنے کو تضیع اوقات اور بے سود سمجھیں گے۔''

[اخبار رفیق ہند۔جلد نمبر ا،لاہور]

دراصل سرسید احمد خان صحافتی تحریک میں بھی معاشرے اور قوم کی فلاح و بہبود پوشیدہ تھی۔انکا صحافتی شعور حق گوئی اور راست بازی سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعہ آزادی خیال اور آزادی اظہار کو ضروری قرار دیا تھا۔انکے تبصروں میں انگریزی انداز کے صحافت کا اثر نظر آتا ہے۔ان کے خیال میں صحافی کے فرائض تین قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ صلاح دینے والا،تربیت کرنے والا اور معاشرت کی اصلاح کرنے والا ہے۔ایک ہوشمند اور باخبر صحافی کی طرح انہوں نے انگریزی اخبارات کا مقابلہ مقامی زبانوں کے اخباروں سے کیا اور اخبار نویسوں کو جھوٹ اور تہمت کے خلاف احتجاج پر آمادہ کیا۔

سرسید احمد خان صحافت کے اصول وقوانین سے آگاہ ایک پختہ کار صحافی کی طرح آزادی رائے کا احترام کرتے تھے۔وہ غور وخوض کے بعد ہر چیز کے بارے میں خود رائے قائم کرتے اور اس کا اظہار بھی بے خوف وخطر کر دیتے تھے۔ جس کا ثبوت گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے اداریوں اور متفرق مضامین سے مل جاتا ہے۔

سرسید احمد خان کے علی گڑھ تبادلہ ہونے پر سائینٹفک سوسائٹی کا دفتر بھی یہیں منتقل ہو گیا تھا اور علی گڑھ سے ہی اس کے اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کا اجرا ۳۰/مارچ ۱۸۶۶ء کو ہوا جس کے سرورق پر نیم دائرے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ انگریزی میں اور اس کے نیچے ''اخبار سین ٹیفک سوسیٹی'' اردو میں لکھا تھا۔ابتدا میں یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور اس کا ہر صفحہ دو کالموں میں منقسم ہوتا تھا۔ایک کالم پر اردو اور اس کے متوازی دوسرے پر انگریزی ترجمہ چھپتا تھا۔اس

کام کے لیے سوسائٹی سے باصلاحیت مترجمین کو منتخب کیا گیا اور کتابوں کے ترجمے کا ایک طویل پروگرام بھی مرتب ہوا۔ جس سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی روایت مقبول ہوئی۔

۸ ستمبر ۱۸۷۶ء میں ایک خاص تبدیلی یہ ہوئی کہ جگت سنگھ رئیس تاجپور ضلع بجنور نے اپنا پریس مع اخبار پروگریس سائینٹفک سوسائٹی مرحمت کردیا۔ چنانچہ اب کے گزٹ کے سرنامہ پر لکھا جانے لگا کہ

''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جس میں اخبار پروگریس بھی ضم ہوگیا ہے۔''

جون ۱۸۷۷ء سے صرف علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ لکھا جانے اور مشہور بھی اسی نام سے ہوا۔ اس کا ماتو Motto حسب ذیل ہے۔

''آزادی چھاپے کی ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلی اور جعلی حق رعیت کا۔''

Liberty of Press is a prominent duty of the Government and a natural right of the subject.

گزٹ میں تعلیم، تاریخ، سیاست، مذہب، ادب، سائنس اور دیگر موضوعات پر طبع زاد مضامین اور ترجمے شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تعلیمی مہم کو تیز کرنے کے لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی رپورٹیں بھی طبع ہوتی تھیں تاکہ عوام اس کارگزاری سے واقف ہوسکیں۔ سرسید احمد خان کے انتقال کے بعد گزٹ کی انفرادی حیثیت ختم ہوگئی اور اپریل ۱۸۹۸ء میں وہ کالج میگزین میں ضم ہوگیا۔

☆ : تہذیب الاخلاق

لندن کے دورانِ قیام میں سرسید احمد خان کو ایک ایسا رسالہ جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کے ذریعے قوم کی ذہنی تربیت کی جاسکے۔ اس کے بارے میں انہوں نے محسن الملک کو ۱۸۷۰ء میں لکھا۔

''ایک خبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا تجویز کرلیا ہے۔ اور تہذیب الاخلاق، اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں سوشل رفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا منظر نامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوالیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے۔ [سید احمد]''

سرسید احمد خان کی صحافتی زندگی میں رسالہ تہذیب الاخلاق بے حد خاص رہا ہے۔ اس رسالے کو نکالنے کا واحد مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم اور قوم کی تری کی راستوں پر گامزن دیکھنا تھا۔ لہٰذا لندن واپس آکر انہوں نے

تہذیب الاخلاق کا اجراء ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو کیا اور تحریر کیا۔

''اس پرچے میں صرف مضامین مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھاپہ ہوتے ہیں اور اس سبب سے اخبارِ مصارد دیار اس میں مندرج نہیں ہوتے۔ منصوبہ اس پرچہ کے اجراء سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں وہ بھی مٹائے جاویں۔'' [رسالہ تہذیب الاخلاق۔]

اس شمارے میں آگے چل کر انہوں نے مزید وضاحت کی:

''تہذیب الاخلاق کے جاری کرنے سے ہماری قوم کی حالت معاشرے کی اصلاح مقصود ومطلوب ہے اور اسی واسطے سوشل رفارمر یعنی تہذیب الاخلاق اس کا نام رکھا۔'' [ایضاً۔ص ۸]

ابتداً یہ پرچہ پندرہ روزہ تھا لیکن بہت جلد اس نے ایک ماہانہ رسالہ کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے بانی کے علاوہ اس کے دوسرے لکھنے والوں میں محسن الملک، ذکاء اللہ، محمد احسان اللہ عباسی، الطاف حسین حالی اور وقارالملک کے نام قابل ذکر ہیں۔ سرسید احمد خان کی زندگی میں یہ تین بار نکلا اور بند ہوا۔ اس کی مدت عمر دس سے آگے نہ بڑھ سکی پہلی بار چھ سال کے بعد ۱۸۷۷ء میں بند ہوا اور قارئین کے اصرار پر سال بھر کے لیے ۱۸۷۹ء میں دوبارہ شائع ہوا۔ پھر ۱۸۸۱ء میں اس کا سلسلہ اشاعت منقطع ہوا اور تیسری بار اس کا اجراء ۱۸۹۴ء میں ہوا اور ۱۸۹۷ء تک چھپتا رہا۔ سرسید احمد خان کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ محسن الملک کی ادارت میں دسمبر ۱۹۰۷ء تک شائع ہوا۔ پھر وحیدالدین سلیم اس کے مدیر ۱۴ر جنوری ۱۹۰۹ء تک رہے۔ اور تقریباً پچھتر سال بعد موجودہ دور میں وائس چانسلر سید حامد نے اس کا اجراء فروری ۱۹۸۳ء میں کیا جو تاحال جاری ہے۔

''تہذیب الاخلاق'' سرسید احمد خان کا ایک نہایت اہم کارنامہ ہے۔ جس کے ذریعہ انہوں نے جدید رجحانات کو پیش کر کے عام کیا اور ان تمام موضوعات پر مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے جن کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد، رسم ورواج، ادب وشاعری موجودہ صورتِ حال اور معاشی سماجی وسیاسی مسائل سے تھا۔

تہذیب الاخلاق کے ذریعے سرسید احمد خان ان مسلمانوں کی اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی حالت کو درست کر کے ان کے باعمل خیالات، فضول توہمات اور جاہلانہ اعتقادات کی جگہ روشن خیالی، بلند حوصلگی اور اچھے اخلاق پیدا کرنے کا کام کیا۔

تہذیب الاخلاق قوم کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے اثر سے مذہب، اخلاق، تعلیم اور ادب کی

سطح پر فرد و معاشرہ کے انداز نظر اور سوچ میں ایسی تبدیلیاں آئیں کہ سرسید تحریک نئی دنیا میں بسانے میں کامیاب ہوگئی۔ جس کا اظہار خود سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے آخری پرچے میں کیا۔

''ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا۔ اردو زبان کے علم و ادب کا ترقی پانا یہی ہماری مرادیں تھیں۔ اب بہت لوگ ہیں جوان باتوں کو پکارتے ہیں گو اس وقت ٹیڑھی میڑھی لہریں کھاتے ہیں مگر پانی میں حرکت ہی زبانا کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنی پنسال میں آپ چورس ہو رہے گا۔'' [حالات سرسید۔ بلا دوم۔ ص۔ ۴۸]

برصغیر کی سرزمین نے اب تک ایسا راہبر پیدا نہیں کیا جس نے فکر و عمل کو ملا کر ایک کر دیا ہو اور جس نے اتنی جہتوں میں ایک ساتھ کام کیا ہو۔ ان کے ہاں تفکر بھی ہے اور قلم بھی۔ تقریر بھی ہے تحریر بھی۔ قدیم خیالات بھی اور جدید خیالات بھی اور وہ دونوں کا امتزاج کر کے ایک ایسی نئی صورت پیدا کرتے ہیں جو ان کی زندگی میں قدرے کم لیکن بعد کے زمانے میں پوری قوت سے اس طرح ابھرتی ہے کہ آج ہم جو کچھ ہیں اس میں سرسید احمد خان شامل ہیں۔

3.5 : خلاصہ

سرسید احمد خان کا شمار ہندوستان کی ان عظیم اور ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ جس کا نام ان کے وقار تمکنت، علم و ادب میں سربلندی، سیاست و فراست اور معلم قوم کی وجہ سے صفحہ تاریخ پر ہمیشہ درخشاں ستارے کی مانند چمکتا رہے گا۔ سرسید احمد خان کی علمی و ادبی تحقیقات میں تاریخ کتب منفرد و معتبر حیثیت رکھتی ہے۔ انیسویں صدی کے روشن خیال طبقے میں سرسید احمد خان کی تاریخی شعور کو بڑے احترام کی نگاہ دیکھا جاتا تھا۔ تحقیق و تنقیدی نگاہ سے سرسید احمد خان کی تاریخی کتب معتبر مانی جاتی ہے۔ مثلاً جا جم تاریخ ہند کے موضوع پر مبنی ہے۔ جلاء القلوب بذکرا الجواب میں سرسید احمد خان کی عمدہ تحریر ہے۔ آثار الصنادید سرسید احمد خان کی ایک شہکارہ تصنیف ہے۔ اس کتاب میں سرسید احمد خان کی تحقیقی شعور کی بھرپور نمائندگی ہے۔ چونکہ سرسید احمد خان نے ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کو بے حد نزدیک سے دیکھا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی بشتر تحریروں و تصانیف میں انیسویں صدی کی سیاسی حالاتِ زندگی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ تاریخ ضلع بجنور میں ۱۸۵۷ء کے خلفشار حالات کا ایک تذکرہ ہے۔ دراصل سرسید احمد خان کی شخصیت ایک ایسی انجمن کی جس کی روشنی سے ادب اور تاریخ دونوں منور ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت مورخ مسلم ہے۔ سرسید احمد خان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف علماء و دانشوروں نے اپنے منفرد انداز سے کیا ہے۔ صحافت کے میدان میں بھی سرسید ایک مجاہد کے طور پر نظر آتے ہیں۔

خاص طور سے ان کے تین بڑے کارنامے میں (۱) سیدالاخبار (۲) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۳) تہذیب الاخلاق۔

سرسیداحمدخان اپنے پرچے کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی ومعاشی زندگی کوروشن بنانا چاہتے تھے۔ اپنی تحریروں اور مضامین کے ذریعہ تعلیمی بیداری کے ساتھ ساتھ اردوصحافت میں حقیقت نگاری حق گوئی کوفروغ بخشا ہے۔سرسیداحمدخان کے نزدیک صحافت ایک ایسا پل ہے جومعاشرے وقوم کی چلاتی وبہتری کا کام براہِ راست کرتی ہے برصغیر کی سرزمیں میں اردوصحافت کوایک نئی شناخت سے روشناس کرانے میں سرسیداحمدخان کا نام معتبر ہے۔

3.6 : نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ سرسیداحمدخان کی تصنیف ''آثارالصنادید'' کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۲۔ جام جم پرایک نوٹ لکھئے۔

۳۔ ''سرسیداحمدخان کی حیثیت ایک مورخ مسلم ہے''اس قول کی تائید یا تردید کیجیے۔

۴۔ اردوصحافت کے آغاز پرروشنی ڈالیں۔

۵۔ سرسیداحمدخان کی صحافتی زندگی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

3.7 : فرہنگ

الفاظ	معنی
جدول کش	صفحات کتاب پرتصویر کھینچنے والا
طبقہ	آدمیوں کا فرقہ یا کروہ
استفادہ	فائدہ حاصل کرنا
رونق	چمکدار
آثارالصنادید	پرانے لوگوں کی یادگار
تلخ کلامی	کڑوی باتیں کرنا
تعارف کرنا	جان پہچان
محقق	تحقیق کرنے والا
صحافت	اخبارنویسی

منزل مقصود　　جس جگہ پہنچنے کا ارادہ ہو

3.8 : سفارش کردہ کتابیں

۱۔ تاریخ ادب اردو (جلد چہارم)　　جمیل جالبی

۲۔ روح صحافت　　امداد صابری

۳۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک　　خلیق احمد نظامی

۴۔ سید احمد دہلوی: حیات اور کارنامے　　زہرہ جعفری

۵۔ اردو صحافت اور سرسید احمد خان　　عبدالحی خان

۶۔ سرسید اقبال اور علی گڑھ　　اصغر عباس

☆☆☆

باب : چہارم

سرسیدتحریک اوراردوادب

اکائی کے اجزاء

4.1 مقاصد
4.2 تمہید
4.3 موضوع کی وضاحت
4.3.1 : تحریک کی تعریف
4.3.2 : علی گڑھ تحریک کا پس منظر
4.3.3 : علی گڑھ تحریک کے اردو ادباء
4.3.4 : سائنٹفک سوسائٹی،اغراض ومقاصد
4.3.5 : تہذیب الاخلاق اور مضمون نگاری
4.4 : خلاصہ
4.5 : نمونے کے امتحانی سوالات
4.6 : فرہنگ
4.7 : شفارش کردہ کتابیں

4.1 : مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔

۱۔ تحریک کی تعریف سے واقف ہوسکیں گے۔

۲۔ علی گڑھ تحریک کے پس منظر سے واقف ہوسکیں گے۔

۳۔ علی گڑھ تحریک کے اردو ادباء کے متعلق سے واقف ہوسکیں گے۔

۴۔ سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض ومقاصد کے متعلق واقف ہوسکیں گے۔

۵۔ تہذیب الاخلاق اور مضمون نگاری کے متعلق واقف ہوسکیں گے۔

4.2 : تمہید

برصغیر پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی اور سقوط دہلی کے بعد مسلمانان برصغیر کی فلاح و بہبود کی ترقی کے لیے جو کوشش کی گئیں عرف عام میں وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئیں۔ سرسید احمد خان نے اس تحریک کا آغاز جنگ آزادی سے ایک طرح سے پہلے سے ہی کر دیا تھا۔ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ لیکن جنگ آزادی نے سرسید احمد خان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان ہی واقعات نے علی گڑھ تحریک کو باوآور کرنے میں بڑی مدد دی۔ لیکن یہ پیش قدمی اضطرار نہ تھی بلکہ اس کے پس پست بہت سے عوامل کارفرما تھے۔ علی گڑھ تحریک کے مطالعہ سے قبل تحریک کے معنی و مفہوم سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

4.3 موضوع کی وضاحت

4.3.1 : تحریک کی تعریف

تحریک کی تعریف ادبی نقطہ نگاہ سے یوں کی جاتی ہے۔

۱) تحریک جمود اور ٹھہراؤ کی یک رنگی کو توڑ کر ہمہ رنگی اور تنوع کو پیدا کرنے کا نام ہے۔

۲) انسانی فطرت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ زیادہ لمبے عرصے تک یکسانیت اور یک رنگی کو قبول نہیں کر سکا۔

۳) اس کے داخل میں نقیر اور تبدیلی کی آرزو خود بخود کلبلانے لگتی ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش بھی تحریک کے لیے ابھارتی ہے۔

۴) تغیر کی یہ خواہش اگر ایک عام فرد تک محدود ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

۵) اگر یہی تغیر کی خواہش لاشعوری طور پر شعراء و ادباء کی تخلیقات میں پائی جانے لگے تو یہ رجحان ہے۔

۶) یہ رجحان جب معاشرے کے ایک بڑے طبقے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو وہ تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مذکورہ نکات کی روشنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک کا ایک نام ہے۔ مثلاً سرسید تحریک، ترقی پسند تحریک وغیرہ۔ تحریک کا تعلق افراد و معاشرے دونوں سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تحریک کا تعلق شعور سے ہوتا ہے۔ تحریک کے اصول اور رہنما ورہبر ہوتے ہیں۔ یہ ایک خاص سمت میں سفر کرتی ہے۔ کسی بھی ادبی تحریک کا تعلق بنیادی طور پر چار ادوار سے جوڑا ہوتا ہے۔ مثلاً تحریک کی اساسی تصور کا نمو۔ ہمدردانہ جذبے کے فروغ، تقلید اور پیروی کا فروغ اور چوتھا زوال کا دور۔

4.3.2 : علی گڑھ تحریک کا پس منظر

علی گڑھ تحریک کے پس منظر کو جاننے کے لیے انیسویں صدی کے نصف اوّل کے سیاسی منظرنامے کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ 1857 سے قبل کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی حالات کو بھی بہت بہتر نہیں کہا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں مغلیہ سلطنت برائے نام رہ گئی تھی۔ اس دور میں ہندوستان کے اکثر صوبے سرکش جاگیرداروں کے ماتحت تھے جو مغل بادشاہوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا، ان کے لیے ان حالات کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی شکست ہوگئی، اور مکمل طور سے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ 1857 کی جنگ آزادی سے ہندوستانی مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان سب سے زیادہ ہوا، اس کی وجہ یہ تھی اس جنگ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور انگریزوں کا ماننا تھا کہ ہندوستانی مسلمان ان کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اس جنگ آزادی کے ردِّعمل میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ خسارہ ہوا۔ اشفاق احمد اعظمی لکھتے ہیں:

> ''غدر 1857 نے حکومت کو ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں سے حد سے زیادہ برہم کر دیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی زندگی اس ملک میں دشوار ہوگئی۔ کتنے مسلمانوں کو غدر کے الزام میں سزائے موت دے دی گئی کتنے کے گھروں کو اجاڑ دیا گیا۔ ان کی جائیدادیں اور ان کی املاک کو ان سے نہایت بے دردی سے چھین لیا گیا ان پر روزی روزگار کے تمام راستے بند کر دیئے گئے مسلمان زمینداروں، تعلقہ داروں اور اس قوم کے سربرآوردہ اشخاص کی عزت و آبرو سبھی کچھ برباد کر دی گئی، غریب مسلمانوں کے چھوٹے موٹے پیشے اور کاروبار کو تباہ کر دیا گیا جس سے صنعت گر، اور ہنرمند مسلمانوں کی بھی روزی ماری گئی۔ اس طرح مسلمانوں کے اندر معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی ہر اعتبار سے بدحالی پیدا ہوگئی۔''

سرسید احمد خان نے 1857 کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نازک دور نے سرسید کو ذہنی کشمکش اور عجیب پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے برطانوی نظر سے مسلمانو ں کے خلاف قائم کو دور کرنے کی پیہم کوشش کی اور مسلمانوں کی فوز و فلاح کے لیے مشکل سے مشکل کام کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور وہ اپنے اس عظیم مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

سرسیداحمد نے اَسّی برس کی طویل عمر پائی۔ 1817 میں دہلی کے معزز اور شریف گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کے احوال کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور 1817 تا 1837 ہے جوان کے بچپن جوانی اور تعلیم کا دور ہے جس دور میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ دوسرا دور 1838 تا 1857 کا احاطہ کرتا ہے۔ اس دور میں سرسید کی بہت سی مشہور تصانیف منظر عام پر آئیں۔ اس دوران انھوں نے نوکری، دیگر ادبی خدمات انجام دیں۔ تیسرا دور 1877 تک محیط ہے۔ اس دور میں انھوں نے قوم کے مابین اتحاد و اتفاق میل جول اور بھائی چارے پر زور دیا ہے، اس دور میں انھوں نے لندن کا سفر کیا اور وہاں کی یونیورسٹیوں کے تعلیمی نظام سے بہت متاثر ہوئے، اور انھوں نے لندن ہی میں اپنے ذہن میں' ایک خاکہ بنالیا تھا کہ ہندوستان میں ایک عظیم یونیورسٹی مسلمانوں کے لیے قائم کریں گے۔ اسی سفر کا نتیجہ ہے کہ سرسید نے ایک اہم کتاب' خطبات احمدیہ' لکھی، یہ کتاب' لائف آف محمڈن' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ ان کی زندگی کا آخری دور 1877 تا 1897 ہے یہ دور اس اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں سرسید نے مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور علمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اردو ادب میں بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں، لیکن علی گڑھ تحریک ان تمام تحریکوں میں اپنی انفرادی شان رکھتی ہے، اس تحریک کو مکمل ادبی تحریک نہیں کہا جاسکتا ہے۔ یہ سرسید کی سیاسی، سماجی، مذہبی، علمی و ادبی، کاوشوں کی وجہ سے وجود میں آئی اس لیے اس تحریک کو سرسید تحریک کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اس تحریک نے اردو شعر و ادب پر بھی گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ خلیق احمد نظامی اپنی کتاب' سرسید اور علی گڑھ تحریک' کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کی گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی فکری، علمی، سماجی، مذہبی، سیاسی اور ادبی تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر سرسید اور علی گڑھ تحریک بلا واسطہ یا بالواسطہ اپنے اثرات نہ چھوڑے ہوں سرسید اور ان کے رفقاء کے لیے مدرسۃ العلوم ایک تعلیمی درس گاہ، نئے فکری رجحانات کی ایک علامت احیاء ملی کی ایک تحریک کا نام تھا۔ یہاں' آدم گری' بھی ہوتی تھی اور تعمیر ملت کا سامان بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ یہاں وقت کے اشاروں کو سمجھنا بھی سکھایا جاتا تھا اور اس کے دھاروں کو موڑنے کی صلاحیت بھی پیدا کی جاتی تھی۔ سرسید کی بلند حوصلگی، عزم راسخ خلوص نیت اور جہد مسلسل نے اس مشکل اور متنوع کام کو ایک تحریک کی شکل دے دی تھی زمانے کے پیچ و خم کے ساتھ تحریک کے خدو

خال بھی بدلتے رہے لیکن سرسید کے افکار کی معنویت ہر دور کے لیے بڑھتی ہی رہی اور ان کی یہ آواز برابر فضاؤں میں گونجتی رہی:

سنگ تربت ہے مرا گرویدہ تقریر دیکھ
چشم باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ''

علی گڑھ تحریک ایک اہم تحریک تھی اس سے ادبی تحریک کو تقویت حاصل ملتی رہی ہے، سائنٹفک سوسائٹی، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، تہذیب الاخلاق، اور ایم او کالج کے بہی خواہوں نے تحریر و تخلیق پر اتنا زور دیا کہ جس کی وجہ سے شعر و ادب کا ایک معیار سامنے آ گیا۔ سرسید احمد خاں نے زندگی کے آخری ایام کو ایم او کالج کے لیے وقف کر دیا تھا، علی گڑھ تحریک کو با آسانی سمجھنے کے لیے اس کی فکری بنیادوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

علی گڑھ کی پہلی فکری بنیاد مادیت اور ترقی پر تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی میں ہندوستان کی شکست ہوئی، جس کا خمیازہ ہندوستانی مسلمانوں کو زیادہ اٹھانا پڑا۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کو معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مالی پریشانیاں قدم قدم پر آنے لگیں، ان مشکلات کا حل سرسید احمد خاں نے ڈھونڈنا شروع کر دیا، آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستانی مسلمان انگریزی حکومت سے مقابلہ آرائی کے بجائے ان کا ساتھ دیں، کیونکہ قوم کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ انگریزی حکومت کا مقابلہ کرتے اور سرسید نے یہ واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ مادی خوش حالی مغربی علوم و فنون کو حاصل کیے بغیر نہیں کی جا سکتی ہے۔

سرسید احمد خاں نے علم کے قدیم تصور کو رد کیا ہے ان کا خیال تھا ایسا علم حاصل کیا جائے جس سے قوم کی ترقی ہو اور معاشی زندگی میں دشواریاں نہ پیش آئیں۔ سرسید مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے دلوں میں جو نفرت تھی اس کو ختم کرنا چاہتے تھے اس لیے 'اسباب بغاوت ہند' لکھی۔ وہ برابر مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے رہے کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دیں اور علمی میدان میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں، ایسا کرنے سے ہی قوم کی معاشی زندگی میں خوش حالی آئے گی:

''1857 کی بغاوت کے نتیجے میں برطانوی ظلم اور زیادتی سے ہونے والے ذاتی نقصان اور قومی سانحے کی طرف سرسید کے حساس مزاج نے شدید ردعمل کا ثبوت دیا سرسید کے اس کامل یقین کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو دوام حاصل ہو چکا ہے انھیں اس بات پر مائل کیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دیں بعد میں بغاوت پر قابو پا لینے کے نتیجہ میں انگریزوں کی جانب سے ہندوستانیوں پر جو ظلم اور زیادتی ہوئی اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سرسید نے خود کو ملک و

قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔اس صورتِ حال نے ایک نئے سرسید کو جنم دیا۔''

علی گڑھ تحریک کی دوسری فکری بنیاد عقلیت پر مرکوز تھی۔سرسید کا ماننا تھا کہ مذہبی معاملات میں عقل کا دخل ہونا چاہیے اور بغیر عقلی استدلال کے آنکھ بند کر کے مذہبی مسائل کو قبول نہیں کرنا چاہیے اس لیے انھوں نے تقلید کی پرزور مخالفت کی ہے۔سرسید نے قرآن پاک کی تشریح عقلی دلائل کی روشنی میں کی۔انھوں نے قرآن شریف کے اکثر واقعات اور قصے کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مذہب اسلام کو سائنس، فلسفے اور قانون کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اس لیے سرسید نے تمام معجزات اور کرامات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔انور سدید رقمطراز ہیں:''سرسید نے مذہب کا خول توڑنے کے بجائے اسے فعال بنانے کی کوشش کی۔اس لحاظ سے سرسید نے مذہب کی محرک قوت سے بھی کام لینے کی کوشش کی۔ایک ایسے زمانے میں جب مذہب کے روایتی تصور نے ذہن کو زنگ آلود کر دیا تھا سرسید نے عقل سلیم کے ذریعے اسلام کی مدافعت کی اور ثابت کر دیا کہ اسلام زمانے کے نئے تقاضوں کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ نئے حقائق کی عقلی توضیح کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔''

سرسید کے مذہبی افکار ونظریات پر اس دور کے دانشوران ادب نے بہت نکتہ چینی کی تھی اور آج بھی ان کی اس مذہبی فکر سے مسلمان اتفاق نہیں کرتے ہیں اور سرسید کے عہد میں یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ اگر سرسید، مذہب اسلام کو عقل کے ترازو میں تولنے کی کوشش نہ کرتے تو اس دور میں ان کی اتنی مخالفت نہ ہوتی۔ان کے اہم معاصرین حالی، شبلی، نذیر اور وقار ملک وغیرہ نے ان کے اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے باوجود مذہبی معاملات میں ان کی عقلیت پسندی سے اختلاف کیا۔سرسید نے مذہبی معاملات کو عقل کے مطابق دیکھنے کی اس لیے کوشش کی تھی کیونکہ مذہب اسلام میں بہت سی نئی چیزیں داخل ہوگئیں تھیں، سرسید ان بدعتوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔نورالحسن نقوی کا یہ اقتباس قابل غور ہے:

> ''نتیجہ یہ کہ قرآن حکیم اور مستند حدیثوں کی پیروی کے بجائے مسلمانوں کو مختلف تشریحوں اور تفسیروں کے مطابق عمل کرنا پڑا اس راہ سے غلط اور غیر معتبر روایتیں بھی شامل ہوگئیں سرسید کا عقیدہ تھا کہ روایتیں جزو اسلام نہیں اور المیہ مجتہدین کے قیاسی واجتہادی مسائل کا اصل مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔سرسید ان مجتہدین کی رائے کو بس اتنی وقعت دیتے تھے جتنی کسی قانون داں کی رائے کو دی جاسکتی ہے۔''

سرسید کی عقلیت پسندی کے ضمن میں یہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سرسید نے اسلام کی ترجمانی میں انیسویں صدی کی عقلیت کو محدود معنوں میں استعمال کیا۔انھوں نے اسلام سے ان سارے عناصر کو نکال باہر کیا جو ان کے نزدیک ان کے عہد کی ضرورتوں کے مطابق نہیں تھے۔انھوں نے مذہب کی کورانہ تقلید کو غلط ثابت کیا اور ہر عہد میں مجتہد کی ضرورت پر زور دیا۔''

سرسید عقلیت پسندی کے ذریعہ مذہبی اصلاح کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے عہد کے تناظر کو مدنظر رکھتے ہوئے عقلیت پسندی پر زیادہ زور دیا۔جدید تعلیم کے تعلق سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کفر اور الحاد کی طرف لے جاتا ہے اور سرسید عوام کو اس غلط فہمی سے دور رکھنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے مذہب اسلام کو جدید علوم اور سائنس کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے قدیم روایات جو اسلام میں داخل ہوگئیں تھیں ان کو اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا کہ اسلام میں ان کی کوئی جگہ نہیں ہے۔اس کی متعدد مثالیں ان کی تفسیر 'تبیین القرآن' میں مل جائیں گی۔

سرسید نے جبرئیل اور فرشتے کے وجود، شق صدر اور معراج کا واقعہ، پیغمبروں کا پیدا ہونا جیسے اہم موضوعات پر اظہار کر کے مسلمانوں کو حیرت میں واستعجاب میں ڈال دیا تھا اس بڑھی ہوئی عقلیت پسندی کی وجہ سے اس دور میں ان کو کافر بھی کہا گیا تھا۔

علی گڑھ تحریک کی تیسری بنیادی فکر اجتماعیت پر تھی، سرسید نے اجتماعیت پر اس لیے زور دیا ہے کہ انفرادی کوشش سے کسی مسئلہ کا حل ممکن نہیں ہے اور ان کا ماننا تھا کہ یہ زمانہ انفرادی کوشش کا نہیں ہے وہ پوری قوم کو متحرک رکھنا چاہتے تھے سرسید نے اظہار رائے کی آزادی پر زور دیا ہے، اظہار رائے کی آزادی میں گورنمنٹ، مذہب، برادری اور قوم میں خوف بالکل نہیں ہونا چاہیے، اس لیے انھوں نے آزادی پر زیادہ زور دیا تا کہ اس سے قوم کی حق تلفی نہ ہو، اظہارِ رائے پر پابندی کی وجہ سے قوم وملت کا بہت بڑا خسارہ تھا۔

سرسید کے خیال میں تصور اجتماعیت میں دو تصورات آتے ہیں، ایک تصور تعلیم جو انفرادی کے بجائے اجتماعی ہونا چاہیے، وہ کہتے تھے سماج کو ذہنی طور پر آزاد ہونا چاہیے اور اجتماعی طور پر ارتقا کی منازل طے کرنے میں منہمک رہنا چاہیے، سرسید تصور تعلیم کو بہت وسیع معنوں میں لیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انفرادی تعلیم کے بالمقابل' قومی تعلیم' کا تصور پیش کرنے میں تامل نہیں کیا ہے انھوں نے انفرادی کوششوں کو لغو بھی قرار دیا ہے۔سرسید نے ایک مرتبہ اپنے لکچر میں کہا تھا:

''تعلیم وتربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن یہ بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور ایک قاعدہ داں کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے کبھی نہیں پکتے پھر اگر تم چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکالو ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔''

دوسری جگہ قومیت کے تصور کا بیان اس طرح کرتے ہیں:''لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے یہی وہ معنی ہیں جس میں لفظ' نیشن' کی تعبیر کرتا ہوں میرے لیے یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ' ہندو' یعنی ہندوستان میں رہنے والی قوم جس زمانہ میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھ کو خاص اسی قوم کی بہبودی کی دل سے فکر تھی۔''

علی گڑھ تحریک کی چوتھی فکری بنیاد نیچریت پر تھی۔سرسید کا ماننا تھا ادب اور تہذیب میں مبالغے اور جذباتیت کی گنجائش نہیں ہے، وہ حقیقت اور اصلیت پر زیادزور دیتے ہیں،سرسید ابتدائی 30 سالوں میں ہندو و مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی پر زیادہ زود دیتے تھے اور ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے یہ قوم کیسے ترقی کرے گی۔سرسید نے شاہ ولی اللہ دہلوی،شاہ اسماعیل شہید،سید احمد بریلوی اور شاہ عبدالمغنی کی عظمت کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کے نظریہ جہاد کو باطل ٹھہرایا تھا اور ہمیشہ ہندوستان کے ہندو مسلم کے مابین ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی،اس زمانے میں دینی معاملات میں ان کے معاصرین نے بھی مخالفت کرنا شروع کردی۔ورنیکلر سوسائٹی کے قیام سے اردو زبان اور ادب کے فروغ کا زیادہ امکان تھا اس لیے اس دور کے کچھ ہندوؤں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔اس آواز سے سرسید کا لاشعور جاگ اٹھا اور یہیں سے ان کے فکر میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی سرسید کو اس بات سے بہت زیادہ رنج ہوا جب ہندوؤں نے یہ تجویز پیش کی کہ سرکاری عدالتوں میں اردو زبان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جانا چاہیے اور اردو زبان جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اس میں تبدیلی لانے کی بہت ضرورت ہے،اس واقعہ سے سرسید احمد خاں کو یہ احساس ہوگیا کہ ہندو مسلم دونوں کو ایک قوم ماننا میری غلط فہمی ہے،ان دونوں کا ایک ساتھ رہنا مشکل ہے اس ردعمل کا اظہار انھوں نے جذباتی انداز میں کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''انھیں دنوں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں

مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے تو انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔''

ہندو اور مسلم اتحاد کو توڑنے کے لیے کچھ انتہا پسند ہندوؤں نے زبان کے تعلق سے اس نزاعی مسئلہ کو چھیڑا تھا ہم ایک طرح سے اس کو ایک سیاسی کھیل سے تعبیر کر سکتے ہیں سرسید کو بعد میں اس کا اندازہ ہو پایا۔ سرسید ہندو مسلمان دونوں کو ایک قوم تصور کرتے تھے اس لیے ہندو اور مسلمان کو دو آنکھوں سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''اے میرے دوستو میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی بن جائے گی۔ پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا۔''

سرسید کا مطمح نظر یہ تھا کہ قوم سیاست سے دور رہے صرف تعلیم کی طرف توجہ مرکوز کرنے کا مشورہ دیا جو اس دور کا تقاضہ تھا۔ سرسید کا یہ پیغام سرسید کی زندگی تک تھا اور جب وقار ملک نے قوم کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا تو یہ قوم ملکی سیاست سے دور نہ رہ سکی۔

4.3.3 : علی گڑھ تحریک کے اردو ادباء

۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے دیگر مسائل پر غور و فکر کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی دنیا میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی تھی۔ ستاون سے قبل اردو شاعری خصوصاً غزل ترقی کے کئی منازل طے کر چکی تھی۔ چونکہ غزل کی پوری دنیا محبوب کے زلفوں میں آ کر ختم ہو جاتی ہے اس نکتہ کو علی گڑھ تحریک کے ہمنوا نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ اس کے برعکس نظم کو رائج ہیں۔

''ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔''

یعنی سرسید نے غزل کی ریزہ خیالی کے برعکس نظم کو رائج کرنے کی سعی کی۔ نظم کے فروغ میں ان کا سب سے بڑا

کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حالی سے مسدس لکھوائی اور پھر اسے اپنے اعمال حسنہ میں شمار کیا۔ دراصل سرسید احمد خان غزل کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ شاعری کو نیچرل کی طرف قریب لانا چاہتا تھے۔ نتیجہ سرسید کے نظریات کا اثر یہ ہوا کہ اردو نظم میں فطرت نگاری کی ایک موثر تحریک پیدا ہوئی۔ ذیل میں چند اہم اردو شعراء کی ادبی خدمات بحوالہ علی گڑھ تحریک درج کیا گیا ہے۔

☆ سرسید کے رفقا کی ادبی خدمات

سرسید تحریک علی گڑھ کے بانی اور روحِ رواں تھے، اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے قدرت نے انہیں ایسے ساتھی مہیا کیے جنہوں نے اپنی نثر تصنیفات کے ذریعے اس تحریک کو بہت پھیلایا۔ اور اس طرح رفاقت کا صحیح حق ادا کر دیا۔ سرسید کی دوربین نگاہوں نے بھی انہی لوگوں کا انتخاب کیا تھا جو ان کے معیار پر پورے اترتے تھے۔

تحریک علی گڑھ کے ستون میں نواب وقار الملک، مشتاق حسین، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، مہدی علی، مولوی زین الدین، مولوی چراغ علی، مولوی سید احمد دہلوی تھے۔ اگر ان نو شخصیتوں کو سرسید کے نورتن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

☆ الطاف حسین حالی

الطاف حسین حالی ایک ایسے مسلم گھرانے کے فرد تھے جو اسلامی تعلیمات پر سختی سے کاربند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عقائد میں مذہب پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کی اولین تصنیف بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ جو ''مولود شریف'' ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اور ڈاکٹر عبدالقیوم کے خیال کے مطابق یہ کتاب ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان لکھی گئی۔ حالی کی دوسری تصنیف ''تریاقِ مسموم'' ہے جو ۱۸۶۷ء میں لکھی گئی۔ یہ کتاب ایک عیسائی پادری کی کتاب کے جواب میں ہے۔ یہ کتاب مناظرانہ انداز کی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ سرسید کی طرح ان کے دل میں بھی اپنے مذہب کو دوسرے مذاہب اور خصوصاً مسیحی مذہب سے اعلیٰ و برتر ثابت کرنے کا جذبہ موجزن ہے۔

سرسید نے مسلمان عورتوں کو اپنی تحریک میں کوئی جگہ نہ دی تھی۔ حالی نے ان کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک کتاب ''مجالس النساء'' دو حصوں میں ۱۸۷۴ء میں لکھی۔ جس پر وائسرائے نے انہیں چار سو روپے بطور انعام دیے۔ خود حالی اپنے ترجمے میں لکھتے ہیں:

''لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرائے میں موسوم بہ مجالس النسا لکھی تھی۔ جس پر

کرنل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں مجھے وائسرائے ہند کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔''

حالی ادبی دنیا میں ہمارے سامنے ان حیثیتوں میں آتے ہیں: شاعر، سوانح نگار، نقاد

☆ حالی بحیثیت شاعر

اصل میں مولانا محمد حسین آزاد جدید شاعری کے بانی ہیں۔ حالی بھی اس میں پیش پیش رہے ہیں۔ قدما کی طرز کو چھوڑ کر انھوں نے شاعری سے قوم کی اصلاح کا کام لیا۔ سرسید کی رفاقت اس کو شروع کرنے میں ان کی مددگار ثابت ہوئی۔ سرسید تحریک کا ایک جزو اولین ی تھا کہ قوم کی اصلاح کی جائے۔ اس سلسلے میں حالؔی نے مسدس لکھی جس سے سرسید کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ سرسید اپنے ایک خط میں جو انہوں نے شملہ پارک ہوٹل سے ۱۰/جون ۱۸۷۹ء کو لکھا تھا لکھتے ہیں:

''جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوالایا ہوا اور کچھ نہیں۔''

پوری انیسویں صدی عیسوی میں مشرق میں اس پائے کی نظم نہیں لکھی گئی۔

☆ حالی بحیثیت سوانح نگار:

حالی اس صنف کو اردو ادب میں دوام بخشنے والے ہیں۔ ان سے پہلے سوانح عمریوں کا سرمایہ بہت محدود تھا۔ غیر شعوری طور پر قدما کی تحریروں میں اس صنف کا وجود ملتا ہے۔ سب سے پہلے دکن میں نصرتی کی شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کا عکس ان کی تصنیف ''علی نامہ'' میں ملتا ہے۔ دکن کی مثنویوں میں بھی اس کے کچھ عناصر پائے جاتے ہیں۔ شمالی ہند اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے۔ اردو کے پرانے تذکروں اور مراثی میں بھی اس کے عناصر ملتے ہیں۔ حالؔی کے دور میں محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' لکھ کر اس کا آغاز کیا۔

حالی کے سامنے مغرب کی سوانح عمریوں کے نمونے موجود تھے۔ انہوں نے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس صنف کو قوم کی اصلاح کے لیے استعمال کیا ہے۔ حیات سعدی کے دیباچہ میں وہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔

''بیاگرافی بزرگوں کی ایک یادگار ہے۔ جو قومیں جنہوں نے ترقی کے بعد تنزل کا منہ دیکھا ان کے لئے یہ ایک تازیانہ ہے جو ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ حالی نے قوم کی اصلاح کے لئے قصے کہانیوں سے کام نہیں لیا بلکہ ان شخصیتوں کی زندگی پر جن کے کارناموں کو پڑھ کر ان کے نزدیک مسلمان قوم سبق حاصل کرسکتی ہے۔

حالی نے سوانح نگاری کے لیے سب سے پہلے اپنے روحانی رہنما کی شخصیت کو لیا ہے۔ ''حیاتِ سعدی'' انھوں

نے ۱۸۸۱ء میں لکھنا شروع کی اور ۱۸۸۶ء کے اوائل میں یہ شائع ہوئی۔ حالؔی نے اسے جدید رنگ میں تحریر کر کے ادبی دنیا میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ اس کا اعتراف شیخ چاند رسالہ اردو میں یوں کرتے ہیں۔

''جو علمی انداز حیات سعدی کے لیے اختیار کیا ہے وہ بالکل جدید امتیاز ہے۔''

ڈاکٹر عبداللہ کے نزدیک یہ ایک مفصل ترین سوانح عمری ہے۔ رام بابو سکسینہ نے بھی ''تاریخ اردو ادب' میں اسے بہترین سوانح نگاری قرار دیا ہے۔ شبلی نے بھی اسے بہترین سوانح عمری کہا ہے۔

غالبؔ حالی کے استاد تھے۔ شاگرد ہونے کے علاوہ حالی غالبؔ کے بہترین دوست بھی تھے۔ اس وجہ سے آپ نے غالبؔ کی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا ہے، جانچا اور پرکھا ہے۔ جن واقعات کا آپ کو علم نہیں تھا، ان کے دوستوں سے پوچھا ہے۔ آپ نے مرزا صاحب کی زندگی کے چند مخصوص پہلوؤں کو لیا۔ ان میں غالبؔ کی ظرافت اور زندہ دلی کے عنصر کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ اس عنصر سے وہ اپنی پژمردہ قوم کے دلوں کو شگفتہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی کے
لیے شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ہماری پس ماندہ سوسائٹی کے لیے کچھ کم نہیں۔''

کتنی عجیب سی بات ہے کہ حالؔی، غالبؔ کی ظرافت اور زندہ دلی سے بھی قوم کی پژمردگی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ حالی نے اس کے آخر میں غالب کے مشکل اشعار کی تشریح کر دی ہے۔ جس سے کلام غالب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ شیخ اکرام نے اسے فن کے لحاظ سے مکمل اور فنی شاہکار کہا ہے۔ آپ نے ''غالب نامہ'' میں لکھا ہے۔

''غالب کے متعلق بہترین کتاب ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے
جو انگریزی سے تقریباً نابلد تھا۔''

حالی دلی کالج سے مستفید نہ ہو سکنے پر ہمیشہ ایک خلش سی محسوس کرتے رہے تھے۔ اگر انہیں دلی کالج میں پڑھنے کا موقع مل جاتا تو وہ یقیناً انگریزی زبان حاصل کرتے اور اپنی تقریروں کو اور بہتر بناتے۔

بجنوری کا کہنا ہے۔

''غالب کی شاعری نئی دنیا ہے تو حالؔی اس نئی دنیا کے کولمبس ہیں۔''

ڈاکٹر لطیف اور مہرؔ نے اس میں بہت سی خامیاں بتائی ہیں۔ ان کا کہنا صحیح نہیں ہے۔ کسی کتاب میں چند خامیوں کا نکل آنا کوئی بڑی بات نہیں۔ دنیا میں کوئی تحریر خامیوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔

☆ حیاتِ جاوید

یہ حالی کی آخری تصنیف ہے۔ جسے ۱۹۰۱ء میں مکمل کیا۔ سرسید کی زندگی ہی میں حالؔی نے ۱۸۹۴ء میں اسے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور علی گڑھ میں قیام کر کے تمام ضروری ماخذوں سے پورا فائدہ اُٹھایا دیباچے میں وہ کس صاف بیانی سے لکھتے ہیں:

''ہم میں سرسید پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔''

شبلی کا اس تصنیف کو ''مدلل مداحی'' کہنا اور ''یک رخی تصویر'' قرار دینا مناسب نہیں۔ حالؔی نے تو خود ہی اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے سرسید کے عیبوں اور خامیوں کو بھی نہیں بخشا۔ حالی سے پہلے ایک انگریز کرنل گریم نے سرسید کی زندگی ہی میں ان کی حیات پر ایک کتاب لکھی تھی جس پر سرسید نے اپنا ریویو بھی لکھا تھا۔ اگر حالؔی کو سرسید کی زندگی ہی میں پورا مواد مل جاتا تو وہ اسی وقت اسے شائع کر دیتے۔ حالؔی نے اس شخص کو کیوں اپنا موضوع بنایا؟ اس کا جواب وہ اس کتاب کے دیباچے ہی میں دیتے ہیں لکھتے ہیں کہ:

''ایک بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے مطابق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پاتے۔''

حالی نے پوری دیانت داری سے سرسید کے تمام اعمال کا محاسبہ کیا ہے۔ کہیں بھی طرفداری نہیں کی۔ صالحہ عابد حسین کہتی ہیں:

''جہاں تک مدلل مداحی کا سوال ہے۔ حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس لیے یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے سرسید کے لیے جو کچھ لکھا ہے اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔'' [یادگار حالی]

مہدی کا کہنا ہے:

''ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی ہے۔''

☆ حالی بحیثیت ایک نقاد

اصولِ نقاد کے لیے آپ کی تصنیف ''مقدمہ شعروشاعری'' بہترین کتاب ہے۔ستمبر۱۸۹۳ء میں لکھی گئی۔ابوالخیر کشفی کے نزدیک یہ جدید اردو تنقید کی بائبل ہے۔رام بابو سکسینہ نے اس کتاب کو ان کی شہرت کی وجہ قرار دیا ہے۔ڈاکٹر مصطفیٰ خاں بھی کہتے ہیں کہ مقدمہ حالی کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔کلیم الدین احمد جیسا سخت نقاد بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ:

''حالی صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں اس وقت اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔''

حقیقتاً آپ نے اردو میں تنقید کی ابتدا کی ہے۔مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ پر بھی آپ نے تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ان تنقیدوں میں ان کا ادبی شعور ترقی پسندانہ افکار وخیالات وتصورات پر مبنی تھا۔ان کی دوسری تخلیقات میں بھی یہی چیز کارفرما نظر آتی ہے۔حالی نے سرسید تحریک کے متعلق تہذیب الاخلاق میں بھی بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ان کا سب سے پہلا مضمون ''سرسید اور ان کا کام۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' تھا۔

حالی کی تحریروں میں سادگی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔یہ سادگی ادبیت کا عنصر لیے ہوئے ہے۔حالی کی سادگی لفظوں ہی کی سادگی نہیں ہے بلکہ خیالات بھی ایسے نازک ہیں جن کو ذہن فوراً قبول کر لیتا ہے۔ان کی نثر کو سادہ اور بے تکلف نثر کا بہترین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔سادگی کے ساتھ حسن بھی ہے۔جس کی وجہ سے ان کی تحریریں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔نام ونمود چھوکر نہیں گیا۔ان کے کلام میں خاکساری کا پہلو نمایاں ہے۔سرسید کے بعد حالی پر اعتراضات کی بوچھاڑ پڑتی تھی۔مقدمہ شعروشاعری میں ان کی نثر کے بہترین اوصاف کی عکاسی ہیں۔

☆ مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی کے چھوٹے بھائی علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔آپ ان سے ملنے کے لیے علی گڑھ جاتے ہیں۔وہیں سرسید سے ملاقات ہوجاتی ہے۔یہ ملاقات ان کی زندگی کا رُخ موڑ دیتی ہے۔اس کالج میں چالیس روپے ماہوار پر فارسی کے پروفیسر مقرر ہوجاتے ہیں۔سرسید کے کتب خانے سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔اس کتب خانے نے ان کی ادبی زندگی کو جلا بخشی۔پروفیسر آرنلڈ سے بھی ان کی ملاقات یہاں ہوتی ہے۔شبلی نے ان کو عربی سکھائی۔پروفیسر آرنلڈ کی اسلامی اور عربی سے ایسی واقفیت اور انسیت بڑھی کہ آپ نے اپنی کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' کے ذریعے ان کو اہل مغرب کے سامنے پیش کیا۔شبلی نے ان سے انگریزی اور فرانسیسی پڑھی۔

چھوٹی عمر سے آپ کو اسلام سے لگاؤ تھا۔ جونہی آپ کی تعلیم پوری ہوئی، آپ کو دیارِ رسولؐ اور زیارت کعبہ کا شوق پیدا ہوا اور آپ نے ۱۹ رسال کی عمر میں اس فرض کو پورا کیا۔ ان کے والدان کو وکالت کرانا چاہتے تھے مگر قدرت ان سے اور قسم کے کام لینا چاہتی تھی۔ آپ نے پیشہ وکالت کو خیر باد کہہ کر سرسید تحریک سے وابستہ ہو کر قوم کی خدمت کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ شبلی کی تصانیف کا اغاز ۱۸۸۷ء میں ہو گیا تھا۔ سرسید اور ان کی تحریک کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اسلام کی مدافعت کریں۔ شبلی نے بھی سلسلۂ نامورانِ اسلام شروع کر کے اس کا آغاز کیا۔ حالؔی کی طرح شبلیؔ بھی ادبی دنیا میں ہمارے سامنے ان حیثیتوں سے آتے ہیں۔

۱۔ سوانح نگار

۲۔ نقاد

۳۔ مقالہ نگار یا مضمون نگار

☆ شبلی بحیثیت ایک سوانح نگار اور مورخ

اس صنف کے لئے حالؔی کی سوانح عمریاں موجود تھیں مگر ان کے موضوع حالؔی کے موضوعات سے مختلف ہیں چوں کہ آپ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اسلئے ان کی طبیعت میں جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے۔ وراثت میں شاہانہ مزاج ملا تھا۔ اس لئے شبلیؔ نے ان شخصیتوں پر قلم اُٹھایا ہے جن کے پرتو میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جن کا حامل وہ خود اپنی شخصیت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ شیر کی طرح کچھار میں گھس جانے کے عادی ہیں۔ چاہے انہیں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ سوانح نگار کے ساتھ ساتھ انہوں نے بحیثیت مورخ کے بھی نام روشن کیا ہے۔ بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا۔ روم وشام، مصر وعرب اور ایران کے بڑے بڑے کتب خانے چھان مارے۔ اپنی سوانح عمریوں کے لئے مستند مواد حاصل کیا۔ کیونکہ بغیر کسی تحقیق و چھان بین کے ہم ایک ادبی شہ پارے کو کس طرح مکمل کہہ سکتے ہیں۔ سرسید کی تصانیف میں یہ بار بار کہا گیا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے اور سچائی کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ تحقیق ہے نہ کہ تقلید۔ شبلی بھی اسی پر کار بند نظر آتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کا سارا سرمایہ عربی کتب میں تھا۔ عربی سے فارسی زبان میں منتقل ہوا اور اس طرح بہت سے ردو بدل کے بعد اردو میں آیا۔ مگر فنِ تاریخیت کے معیار پر کوئی کتاب پوری نہیں اترتی تھی۔ اس وقت فضا ہی ایسی تھی کہ لوگ عربی اور فارسی سے بے گانہ ہوتے جا رہے تھے۔ جو لوگ تاریخ جاننا چاہتے تھے انہیں مجبوراً انگریز مصنفین کی کتابوں سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ یہ مورخ اسلام اور اس کی تاریخ کو بڑے غلط طریقے سے پیش کرتے تھے اور اس طرح انگریز قوم کو اسلام دشمنی کا پورا پورا موقع مل جاتا تھا۔ شبلیؔ نے اس چیز کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس کو دور کرنے کا بیڑا

اُٹھایا۔ بلادِ اسلامیہ کے کتب خانوں کو چھان کر مواد حاصل کر کے اپنی تصانیف کو مستند بنایا۔ غیر مسلموں کے غلط اور بے سرو پا اور گمراہ کن اعتراضات کو نہایت مدلل طریقے سے رد کیا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ ہمارے پاس ایسا سرمایہ موجود ہے جس کے لیے ہمیں مزید تحقیق اور چھان بین کی ضرورت نہیں۔ اس طرح شبلی پہلا شخص ہے جس نے مذہب کے ساتھ تاریخ وفلسفہ میں باہمی ربط پیدا کیا ہے۔

اس سلسلے میں ان کی تصانیف یہ ہیں۔ المامون، امام غزالی، سیرت النبیؐ، الفاروق، سیرتِ نعمان اور مولانا روم، یوں تو ان کی تمام تصانیف نہایت بلند پائے کی ہیں مگر جو رتبہ سیرت النبی کو ہے وہ اور کسی تصنیف کو نہیں۔ یہ ان کی آخری اور معرکۂ آرا تصنیف ہے۔ جسے وہ اپنی حیات میں مکمل نہ کر سکے۔ ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی نے ان کے ادھورے کام کو مکمل کیا سید صاحب حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ اس کو لکھ رہے تھے وہ خود ان کو پسند نہیں آ رہا تھا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اس کو صیغۂ راز میں رکھا۔ سارے مکتوبات میں کہیں ایک حرف بھی اس کے متعلق اپنے دوستوں میں سے کسی کو نہیں لکھا۔''

شبلی کے نزدیک اس عظیم انسان کی سوانح لکھنا ایک بہت بڑا کام تھا۔ وہ ساری عمر اس پر ظلم اُٹھانے سے ہچکچاتے رہے۔ اس کا مواد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے پوری اسلامی دنیا کے کتب خانوں کو چھان مارا۔ اپنے ایک خط میں سرسید کو قسطنطنیہ سے لکھتے ہیں۔

''۲۵ مئی۔ سیدی ۲۲ مئی کو یہاں پہنچا۔ دس روپیہ ماہوار کرایہ پر مکان لے لیا ہے۔ آپ دو تین سو روپے بھیج دیں تا کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آ جائے لے لی جائے یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جا سکے۔''

اس سے ان کی سرسید تحریک سے وابستگی بھی پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ شبلی اسلام کے شیدائی تھے۔ اس لئے ایسی تصنیف کا لکھنا ان کے نزدیک فرض تھا۔ اس کے ساتھ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے۔ یعنی پورے عالم اسلام کو ضرورت تھی کہ کوئی صاحبِ علم اس عظیم ہستی کی سیرت پاک پر قلم اُٹھائے۔

چونکہ ان کی طبیعت میں شاہانہ کیفیت پائی ہے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں بھی جوش و بیان عیاں ہوتا ہے۔ ان کی عبارت میں عالمانہ شان و فاضلانہ آن بان اور عالمانہ متانت ہے۔ سیرت النبیؐ کا آغاز کس شان سے ہوتا ہے؟ عبارت میں شعریت پائی جاتی ہے۔ اس میں قدیم میلادوں جیسا رنگ ہے۔ لیکن اس کے باوجود شبلی نے حقیقت بیانی

سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا وہ کر بھی کیسے سکتے تھے۔حضور کے فرمان

''جو کوئی مجھ سے کوئی غلط بات منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔''

انہیں ایک حرف بھی ادھر ادھر نہ ہونے دیا۔شبلی نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے تا کہ ہمارے سامنے ان کی پوری زندگی کے پہلو آسکیں۔کیونکہ سیرۃ النعمان کے دیباچے میں کہا ہے کہ:

''سوانح عمری کے ہیرو کے وہ خصائل ضرور دکھانے چاہیے جن
میں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔''

حضرت محمد مصطفیٰ خداوند تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہونے کے علاوہ آپ ایک بشر بھی تھے۔اس لئے شبلی نے اس پہلو پر بھی بڑی صفائی اور دیانت داری سے روشنی ڈالی ہے۔شبلی نے سیرۃ النبیؐ کے مقدمے میں اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ کوئی بات محسوسات، اصولِ مسلمہ، عقل اور مشاہدے کے خلاف نہ ہو۔ یہ وہ اصول ہیں جن کی جڑیں سرسید کی تحریروں سے ابھر کر باہر پھیلی ہیں۔شبلی نے سیرت النبیؐ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں لکھا جو محسوسات اور عقل و مشاہدے کے خلاف ہو۔الفاروق اور سیرت النبیؐ کے مقدموں میں 'فنِ تحقیق' کے اصول بھی بتا دیئے ہیں۔ان پر سر حاصل بحث کی ہے۔شبلی کو اپنی تصانیف میں الفاروق بہت زیادہ پسند تھی۔

☆ شبلی بحیثیت نقاد

تنقید کے سلسلے میں آپ کی کتاب ''شعرالعجم'' ایک بہترین شہ پارہ ہے۔اس کتاب سے ان کے وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔تحقیق و تدقیق، فصاحت و بلاغت اور سلاست زبان کا بہترین شاہکار ہے۔انگریز مصنف براؤن نے بھی اس کتاب کی افادیت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ کتاب فارسی شاعری کی مکمل تاریخ ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی زبان کے بھی بہت بڑے ماہر تھے۔تنقیدی سلسلے میں ان کی ایک اور کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' ہے۔ان کی تمام تنقیدی کتابوں میں عملی تنقید موجود ہے۔شبلی مشرقی نقاد ہیں یعنی ان کی تنقید میں مشرقی اندازِ تنقید کی گہری چھاپ ہے۔ یہ درست ہے کہ شبلی، سرسید تحریک سے پوری طرح وابستہ تھے مگر جہاں کوئی چیز اپنے عقیدے کے خلاف دیکھی اس کا اظہار اسی وقت کر دیا۔کسی قسم کا لحاظ نہ رکھا، بقول سید عبداللہ شبلی سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے بعض تصورات کا سب سے بڑا باغی بھی ہے۔سرسید سے اختلاف کی وجہ سے انہوں نے ایک جدید علم ''الکلام'' کی بنیاد رکھی ہے۔اس پر ان کی دو کتابیں مشہور ہیں:

۱)علم الکلام: یہ کتاب مسلمانوں کے علم کلام یا فلسفہ مذہبی کی تاریخ ہے۔

۲)الکلام: اس میں مذہب اسلام کے اصولوں کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے دلائل کو مغربی مصنفین کی تحریروں سے مربوط کیا ہے۔

☆ شبلی بحیثیت مقالہ نگار یا مضمون نگار

اس میں بھی آپ منفرد نظر آتے ہیں۔ان کے سامنے سرسید اور حالی کے مضامین تھے۔مگر آپ کا رنگ ہی اور ہے۔ان کے ہاں سرسید جیسی سپاٹ تحریر نہیں ہے اور نہ ہی حالی جیسے طولانی فقرے ہیں۔وہ فضول عبارت آرائی کو پسند نہیں کرتے بلکہ نفس مضمون کو مناسب الفاظ میں بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں۔مضامین میں سلاست، روانی اور شگفتگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ان کے مضامین میں طرز ادا اس قدر اچھوتا اور صاف ہے کہ بڑے سے بڑا فصیح البیان بھی اس قسم کے دقیق مسائل کو ایسی برجستگی اور لطافت کے ساتھ ادا نہیں کرسکتا۔

چنانچہ سرسید کے رفقاء میں شبلی نعمانی کو اپنی منفرد اور گمبھیر شخصیت کی بنا پر ایک بلند مقام حاصل ہے۔وہ ایک ایسا سورج ہے جس نے اپنی شعاعوں سے دنیائے نثر کو تابندگی بخشی۔

☆ نواب محسن الملک مہدی علی

سرسید کے عقلی افکار کے اثرات قبول کرنے والوں میں ان کو اولین مقام حاصل ہے۔اگر سرسید کو اس عقلی تحریک کا دل کہا جائے تو محسن الملک کو یقیناً اس کی زبان اور دماغ کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔انہوں نے سرسید کی عقلی تحریک کو اس انداز میں پیش کیا ہے جسے ان کے بیشتر رفقاء نے اپنی تحریروں کی بنیاد قرار دیا ہے۔وہ بھی سرسید کی طرح ہر بات کو عقل پر پرکھنے کے قائل ہیں۔ان کی تحریروں میں بھی عقل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اہل مغرب کی تقلید کی تھی۔تہذیب الاخلاق میں اپنے مضامین کے ذریعے انہوں نے عقلی تحریک کا پرچار کیا ہے۔انہوں نے مضمون نویسی کے معیار کو بلند کیا ہے۔ان سے ان کی علمیت و وسیع نظری اور انصاف جھلکتی ہے۔آپ سرسید کے سیاسی اور مذہبی امور میں ہم خیال تھے۔محسن الملک سرسید کے متعلق لکھتے ہیں:

''مجھ سے زیادہ سرسید کا جاننے والا، ان کی عزت کرنے والا، ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں۔پھر بھی ۱۸۶۴ء سے ان کے اخیر دم تک میرے اور مرحوم کے درمیان بحث وتکرار قائم رہی۔''

اور سرسید کا ان سے متعلق کہنا ہے۔

''تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔اور تیرا خون میرا خون ہے۔''

محسن تقریر بہت اچھی کرتے تھے۔انہوں نے تقاریر کے ذریعے سرسید تحریک میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ان کی تقریر سن کر حالی جیسے مقتدر لوگوں کو بھی ان کا ہمنوا بننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوتا تھا۔اپنے دور کے فصیح اور شیریں گفتار مقرر تھے۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے انہیں سرسید کا شیریں گفتار ترجمان قرار دیا ہے۔

☆ نواب وقارالملک مشتاق حسین

نواب صاحب کی سرکاری ملازمت کے دوران ہی سرسید سے ان کی دوستی ہوگئی تھی۔سرسید کی سفارش ہی سے آپ حیدرآباد میں ناظم دیوان مقرر ہوئے۔۱۸۶۶ء میں آپ ''سائنٹی فک سوسائٹی'' کے ممبر بنے۔اور تہذیب الاخلاق کے مہتمم بھی ہوگئے۔ان کے مضامین تہذیب الاخلاق میں چھپتے تھے اور ان کے ذریعہ سرسید تحریک کو پیش کرتے تھے۔ مثلاً قوم کی ترقی کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنا،مغرب کی اعلیٰ قوم کی تہذیب ومعاشرت اور اخلاقی قدروں کو اپنانا۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت چھوڑ کر علی گڑھ کالج کی اصلاح وترقی میں حصہ لینے لگے۔''فرنچ اینڈ نپولین ریوولیوشن کا اردو میں ترجمہ کیا۔آپ نماز کے اتنے پابند تھے کہ کچہری میں جب ظہر کی نماز کا وقت آتا تو آپ اُٹھ کر نماز پڑھنے چلے جاتے۔ علی گڑھ میں جب یہ واقعہ پیش آیا تو کلکٹر نے انہیں روکا اور ضد کی۔آپ نے استعفیٰ دے دیا۔اس واقعہ سے ان کی مذہب سے عقیدت اور اصول پرستی اور بے باکی ظاہر ہوتی ہے۔سرسید کے ہم عصروں میں ان خصوصیات کا موجود ہونا لازمی امر تھا۔

☆ ڈپٹی نذیر احمد

نذیر احمد کا بچپن بڑی تنگ دستی اور غربت میں بسر ہوا تھا۔باپ نے ان کو ایک ایسے مدرسے میں داخل کرادیا جو ادھر ادھر سے روٹی مانگ کر اپنے طلباء کا پیٹ بھرتا تھا۔انہوں نے مدرسے کی طالب علمی کے دوران اپنے استاد مولوی عبدالخالق کے گھر کا مسالہ بھی پیسا۔ان کی صاجزادی سے اپنے ہاتھوں پر سل بٹیہ کی مار بھی کھائی۔مولوی صاحب کی پوتی کو بھی کھلایا اور نہایت معمولی کام کیے۔آپ دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔کالج کی تعلیم نے ان کو جلا دی۔وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے۔

سرسید تحریک کے ایک اہم رکن ہونے کی وجہ سے نذیر احمد نے ایک نئی صنفِ ادب کی بنیاد ڈالی اور اس سے قوم کی اصلاح کا کام لیا۔یہ صنف ناول کی تھی۔ناول خود بخود غیر شعوری طور پر معرض وجود میں آ گیا تھا۔ان کو اپنی بچی کو تعلیم

دینے کے لیے کوئی مناسب کتاب نہیں مل رہی تھی۔اس لئے انہوں نے خود ہی ایک اخلاقی اور اصلاحی قسم کی کہانی لکھ ڈالی اور یہ کہانی ''مراۃ العروس'' ای ناول بن گئی۔ چونکہ ان کے ناول مقصدی اور اصلاحی تھے اس لئے کئی ناقدوں نے انہیں ''اردو کا رجرڈ'' سن کہا ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی ان کو ناول نگار نہیں مانتے بلکہ ان کے ناولوں کی تمثیل کہتے ہیں۔نذیر احمد نے قرآن مجید کا آسان اور بامحاورہ ترجمہ بھی کیا۔

☆ مولوی ذکاءاللہ

آپ آزاد اور نذیر احمد کی طرح دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔سرسید تحریک کے اہم رکن تھے۔تہذیب الاخلاق کے بہترین مقالہ نگار تھے۔تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہندوستان کی تاریخ دس ضخیم جلدوں میں لکھی ہے۔جس سے ان کی تاریخ سے دل چسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ مولوی چراغ علی

مولوی صاحب کو ابتدائے عمر ہی سے مضمون نویسی کا شوق تھا۔ان مضامین میں مذہبی رنگ غالب تھا۔آپ نے اسلام کے مخالفوں کے رسائل کے جواب میں اسلام کو برتر و اعلیٰ ثابت کرنے کے لیے مختلف رسائل لکھے۔ پادری عماد الدین کی ''تاریخِ محمدی'' کا جواب ''تعلیقات'' کے نام سے لکھا۔اور تاریخ محمدی کو مدلل طریقے سے نا قابلِ اعتبار قرار دیا۔آپ نے مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی ''براہین احمدیہ'' لکھنے میں مدد دی۔مولوی صاحب مذہبی مناظروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔آپ متعدد علوم اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔عربی، فارسی، کالدی، لاطینی اور یونانی جانتے تھے۔انگریزی میں اتنے ماہر تھے کہ آپ کی انگریزی کی تصانیف پر انگلستان کے اخبارات نے ریویو کیے ہیں۔

4.3.4 : سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض ومقاصد

ہندوستان میں جب مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہوگیا اور اہل ہند تاج برطانیہ کے زیر نگیں آ گئے تو اس موقع پر وہ سب کچھ ہوا جو ایک قوم کے دوسری قوم پر مسلط ہوجانے کی صورت میں بالعموم ہوا کرتا ہے۔اس تبدیلی نے جہاں محکوم کو احساسِ کمتری میں مبتلا کیا وہیں سوچنے والے ہندوستانی ذہنوں نے بدلے ہوئے حالات میں عزت سے جینے اور زندگی کی دوڑ میں زمانے کا ساتھ دینے کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی۔سرسید کا شمار ان ہی اربابِ فکر میں ہوتا ہے۔انھوں نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے حصول کو ناگزیر جانا اور چاہا کہ انھیں

دیگراقوامِ عالم کی تاریخ اورعلوم وفنون سے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت آگاہی بخشی جائے۔ان دِنوں وہ غازی پور میں صدرالصدور تھے۔یہی سے انھوں نے ۱۸۶۳ء میں ایک چندورقی رسالہ ''التماس بہ خدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم ہند'' شائع کیا۔یہ رسالہ دو کالموں میں چھپا۔ہرصفحہ پرایک جانب اردوعبارت اوردوسری طرف اس کاانگریزی ترجمہ تھا۔اس التماس کے مخاطب ہندومسلم دونوں تھے۔سرسید نے تعلیم کے میدان میں اپنے ہم وطنوں کی پس ماندگی کا ذکرکرنے کے بعدلکھا تھا؛'' آؤاب ہم بالاجمان ان وسیلوں پرغورکریں جن سے قومون کی دانائی اورعلوم اورعقل مندی کے اقبال کوترقی ہوتی ہے۔اس امرعظیم الشان کے مطلب کے صحیح نتیجے کے دریافت کرنے کے لیے ہم کوان قوموں کے اگلے اورپچھلے حال پرنظرکرنی چاہیے جوآج کے دن فنون وعلوم کی کھیتی میں سب سے بڑھ کر درجہ رکھتی ہیں۔جب کہ ہم اگلے زمانے اورحال کی تاریخ پرمتوجہ ہوتے ہیں توہم کو بہ طورقاعدہ کلیہ کے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس کی طبیعت میں دوسری قوم نے تخم ریزی نہ کی ہواوراس نے علوم وفنون میں بزرگی اورعظمت حاصل کی ہو۔ایسے شخصوں یا قوموں کی چندمثالیں ہیں جنھوں نے خودآپ ہی اپنی طبیعت سے کوئی فن یااعلم ایجادکیایااس کوتحقیق کیا۔اورپھراس کو برتر درجوں میں پہنچائے گئے۔اورآخرکاراس کوکاملیت کی بلندی پرپہنچادیا۔مگرعموماً ہم کو یہ دریافت ہوتا ہے کہ ایک قوم کسی بات کوتحقیق کرتی ہے اور دوسری قوم اس تحقیقات کواس سے لیتی ہے اور پھراپنی محنت اوراستقلال سے اس کو کاملیت کے درجہ تک پہنچادیتی ہے۔''

آگے چل کرکہا گیا تھا کہ علوم کی افزائش اورکاروبارحیات کانظم وضبط اقوام وافراد کے باہمی لین دین کامرہونِ منت ہے۔لہٰذاعلم وفن کے میدان میں پیچھے رہ جانے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ پیش رووں کے ذہنی،فکری اورعلمی سرمائے سے استفادہ کریں۔مگرافسوس کہ اہل ہندہنوز جمود کے عالم میں ہیں۔اُن کی کاہلی روزافزوں ہے۔اورحالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں، ہربرس جوگزرتا ہے ایک نئی مشکل پیدا کرتا ہے اور ہربرس دقت کوزیادہ کرتا ہے۔وہ مسلمان جن کے آباواجداد فضل وکمال، ذہانت اورادراکی میں اپنا جواب آپ تھے،اوروہ ہندوجن کے بزرگوں نے کبھی پیچیدہ علوم کے ایجاد میں شہرت حاصل کی تھی آج بدنصیبی سے اسلاف کے ناموں کوبھی ڈبوتے ہیں۔

اس افسوس ناک صورت حال سے نجات پانے کے لیے علوم جدیدہ کی تحصیل کو ناگزیرقرار دیتے ہوئے انگریزی زبان اورانگریزقوم کو بہ ایں الفاظ بہ طورنمونہ پیش کیا گیا تھا:

''بلاشبہ آج کے دن فنون اورعلوم کی کھیتی اورترقی کرنے میں انگریزوں نے تمام قوموں سے برتر درجہ حاصل کیا ہے۔اوران کے یہاں تمام مضامین علمی پرخواہ اصل خواہ غیرزبان سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں بہ کثرت موجود ہیں۔''

چوں کہ انگریزی زبان سے ناواقفیت کے سبب ہر کس و ناکس کا ان کتابوں سے فیض یاب ہونا ممکن نہیں۔اس لیے مذکورہ دشواری کا یہ حل ڈھونڈا گیا کہ ''اگر وہ کتابیں اپنی موجودہ حالت میں ہمارے سمجھنے کے قابل نہیں ہیں تو ہم کو جدوجہد کرنی چاہیے۔اور کوئی ایسا بندوبست کرنا چاہیے جس سے وہ ہمارے سمجھنے کے قابل ہوجاویں:'' ایسی کتابوں کو قابل فہم بنانے کے لیے ترجمہ کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ساتھ ہی ایشیا کے قدیم مصنفوں کی اہم اور نادر تصانیف کی اشاعت کو بھی ضروری سمجھا گیا۔وجہ یہ بتائی گئی کہ ہمارے بہت سے عالم مصنفوں کی کتابیں جو کسی زمانے میں کیسے نامی تھے۔روز بہروز معدوم ہوتی جارہی ہیں۔پس اس طرح ہر علم کے عمدہ ذخیرے جن کو ہمارے بزرگوں نے جمع کیا اور تحصیل کیا۔ہماری کاہلی اور غفلت سے رفتہ رفتہ نسیاً ومنسیاً ہوتے جاتے ہیں اور وہ دن بہت دور نہیں ہیں کہ اگر ہم ان کو بچانے میں کوشش نہ کریں تو پھر ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گی۔ان تجاویز پر عمل درآمد کے لیے ایک انجمن کے قیام کا اعلان کیا گیا:

''ایسی بدبخت حالت کے علاج کی راہ نکالنے اور ہمارے ہم وطن ہندوؤں اور مسلمانوں میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک سوسائٹی کا مقرر ہونا تجویز ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوگا: اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفوں کی بہت عمدہ کتابوں کا، دوسرے انگریزی زبان سے اور اردو زبانوں سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا اور چھاپنا جو سب کے لیے مفید ہوں۔''

یہ تجویز بھی رکھی گئی کہ منتخب شدہ کتابیں چار مختلف زبانوں یعنی ہندی، اردو، فارسی، عربی میں تراجمہ کرا کر چھاپی جائیں۔یا اگر کسی خاص وجہ سے ممبران سوسائٹی ان میں سے کسی ایک زبان میں ہی ان کے ترجمے کو حصول مقصد کے لیے کافی خیال کریں تو پھر اسی ایک زبان میں ترجمہ ہو۔ترجمہ کے لیے کسی مذہبی کتاب کا انتخاب نہ کیا جاوے۔اور نہ ہی ممبروں کے انتخاب میں ذات، مذہب یا ملک کی بنیاد پر کوئی امتیاز برتا جاوے۔

سرسید اس رسالے کی اشاعت کے ساتھ ہی مجوزہ سوسائٹی کو عملی شکل دینے میں سرگرم ہوگئے۔انھوں نے کلکتہ کا سفر کیا اور وہاں مولوی عبداللطیف خان بہادر کی رہائش گاہ پر ۱۶/اکتوبر ۱۸۶۳ء کو ''مجلس مذاکرہ علمیہ'' میں حاضرین سے بہ زبان فارسی خطاب کرتے ہوئے انگریزی تعلیم کی ضرورت اور جدید علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی عمدہ کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنا، اور انھیں خاص وعام تک پہنچانا بے حد ضروری ہے۔کلکتہ سے واپسی کے دو ماہ بعد انھوں نے ۹/جنوری ۱۸۶۴ء کو غازی پور میں اپنے گھر پر ایک میٹنگ بلائی۔ جس میں بی سٹیپٹ کے زیر صدارت، سوسائٹی کے اغراض ومقاصد، بناوٹ وغیرہ پر غور وخوص کے بعد اس کا منشور قلم بند

ہوا۔

سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کے متعلق حالی نے ''حیات جاوید'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جو یوں ہے:

''جب تک ہندوستانیوں میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں باوجود یکہ وہ غازی پور میں سرکاری کاموں کے علاوہ بہت سا وقت تبیین الکلام کی ترتیب اور اس کے چھپوانے کے اہتمام میں جو نہایت سخت کام تھا، صرف کرتے تھے اسی خیال میں انھوں نے ایک روز تدبیر اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کی سوچی۔ انھوں نے خیال کیا کہ ملک میں علومِ جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبانوں میں ترجمہ نہ کی جائیں انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا کیونکہ مسلمان انگریزی ترجمے کو گناہ سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے سوا اور قوموں کے لیے کوئی ایسی ترغیب نہ تھی کہ جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ تک کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت تھی اگرچہ ملکۂ معظّمہ کے اشتہار میں اُن کے ملنے کی ہندوستانیوں کو اُمید دلائی گئی تھی مگر ابھی تک عملی طور پر ان وعدوں کا چنداں ظہور نہ ہوا تھا۔''

مغربی علوم کی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے غازی پور میں ایک ایسی علمی سوسائٹی قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی جس کے لیے انگریز اور ہندوستانی حضرات سائنس اور انگریزی ادب کی کتابیں ترجمہ کرسکیں اور حاکم ومحکوم کے درمیان التفات وارتباط کی فضا پیدا ہوسکے۔ اس انجمن کی تاسیس غازی پور میں ہوئی اور اس کا نام ''سین ٹیفک سوسائٹی'' رکھا۔

مذکورہ سوسائٹی کا پہلا جلسہ ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو ہوا۔ سیداحمد خاں صدرالصدور نے مجمع میں گفتگو کی کہ:

''اے صاحبان ہم کو احسان مندی اور خاکساری سے اس خدائے مطلق کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے یہ فرمایا کہ جہاں دو یا تین آدمی نیک کاموں کے کرنے پر جمع ہوتے ہیں وہاں میں اُن میں موجود ہوتا ہوں۔ اب جس مقصد کے

واسطے ہم جمع ہوئے ہیں وہ ہمارے ہم جنسوں کی ترقی سے متعلق ہے۔اسی لیے وہ ایک نیک کام ہے بس ہم کو امید کرنا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ کا فضل ہمارے کاموں پر رہیگا۔'' آمین

ان کے بعد ضلع سپرنٹنڈنٹ پولیس جی ایف آئی گراہم نے تقریر کی کہ:

''اے صاحبو مجھ کو امید ہے کہ تم مجھ کو معذور فرماؤ گے کہ میں اسوقت کو اس گفتگو میں صرف کررہا ہوں میں یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ولولہ ہے اس کا سبب وہ روشن ضمیر اور مستقل مزاج شخص اس سوسائٹی کا بانی ہے جو اپنی عقل اور رویہ دونوں سے اپنے ملک کو برسوں کے خواب سے جگانے میں نہایت کوشش کررہا ہے اور جس کو آئندہ زمانے میں مجھ کو یقین ہے کہ اس ملک کے رہبروں کی فہرست میں ایک نامی جگہ کا صلہ ملے گا اور وہ شخص سید احمد خاں ہیں۔''

اس سوسائٹی کے متعلق مزید تفصیلات دی گئی ہیں:

☆ لقب اور مقصد

اس مجمع کا نام سین ٹیفک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی کیا جاوے گا اور اس کا مقصد یہ ہوگا

۱) ان علوم وفنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی اور کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے۔ایسی زبان میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

۲) ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابوں کو تلاش کر کے بہم پہنچانا اور چھاپنا۔سوسائٹی کو کسی مذہبی کتابوں سے سروکار نہ ہوگا۔

☆ مقام

مستقل قیام ساسائٹی الٰہ آباد میں ہوگا مگر جب تک سوسائٹی بخوبی نہ چل نکلے اس وقت تک ان مقاموں میں ہوگی کہ جہاں جہاں صدرالصدور کا قیام ہوتا رہے گا۔

☆ بناوٹ سوسائٹی کی

سوسائٹی میں ممبر (اول) معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقائے سوسائٹی ہونگے۔معاون ممبر: دوقسموں کے ہوں گے (اول) ممبران حضوری یعنی وہ ممبر جو اسی مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی ہوتا ہے (دوسرے) ممبران مکاتیب یعنی وہ ممبر جو اس مقام کے نہ ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہے۔فاصلے پر ہونے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہ ہوسکیں اور بذریعہ خط وکتابت کے سوسائٹی سے ارتباط رکھیں۔ممبران حضوری اورممبران مکاتیب کی تعداد غیر محدود ہوگی۔آنریری ممبروں کی تعداد دس ہے۔اور رفقائے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوگی اور صاحبان ڈریکٹر پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اودھ اور پنجاب موجود وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں،آنریری ممبر ہوں گے۔

پھر سید احمد خاں نے ان لوگوں کے نام جنھوں نے معاون ممبر ہونے کے واسطے درخواستیں بھیجی تھیں۔جمع کو سنائے اور بیان کیا کہ اہم لیس ایم اے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے اس سوسائٹی کے آنریری ممبر ہونے کو قبول فرمایا۔

سوسائٹی کے مقامی ممبران کی تعداد مجموعی طور پر ۱۰۹ رتھی جس میں ہندوستان کے ہر صوبے کے سربرآوردہ اشخاص مسلمان، ہندواور عیسائی شامل تھے۔

☆ مطبوعات

سوسائٹی کی تشکیل کے بعد اس اہم اور نتیجہ خیز سوال سے دوچار ہوئی کہ وہ ترجمہ کے لیے کن کتابوں کا انتخاب کرے چنانچہ کتابوں کی ایک فہرست مرتب کرکے ہر ممبر کونسل کو ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھیجی گئی۔بیشتر ممبران نے اپنی رائے صدر سوسائٹی کو بھیجی اور چند کتابوں کے حق میں کثرت رائے ملنے پر ترجمہ اور تالیف کے کاموں کی تدابیر کی گئیں۔

جن کتابوں کو منتخب کیا گیا تھا ان کی مجموعی تعداد ۲۸ رتھی، ان میں سائنس، ریاضیات معاشیات، سیاسیات، تاریخ، زراعت، منطق، جغرافیہ، طبقات الارض، اور فلسفہ جیسے موضوعات پر تھی۔مختلف وجوہ کی بناء پر یہ کتابیں ترجمہ نہ ہوسکیں نہ اشاعت کی نوبت آئی۔جن کتابوں کے ترجمہ ہونے کا پتہ چلتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

ا۔رولن صاحب کی قدیم تاریخ یونان سے حصہ اول جو ابتدائے قائم ہونے سلطنت یونان سے اس زمانے تک جب کہ یونان علوم وفنون میں مشہور لوگ ہوئے۔

۲۔رولن صاحب کی قدیم قوموں کی تاریخ یونان سے دوسرا حصہ جو ماوار کے زمانے سے جب کہ یونانیوں اور ایرانیوں زرکسیز کی وفات تک ہے۔

۳۔رولن صاحب کی قدیم قوموں کی تاریخ یونان سے تیسرا حصہ جوموارنادرکسیز کے حال زمانے سے اس کی وفات تک ہے۔

۴۔رسالہ علمِ فلاحت یعنی کاشت کاری مصنفہ رابرٹ اسکاٹ برنی صاحب۔

۵۔رسالہ نیچرالفلاسفی مصنفہ چارلس ٹام لن سن

۶۔رسالہ آب وہوا مصنفہ چارلس ٹام لن سن

۷۔رسالہ علم جرثقیل

۸۔رسالہ درعلم قوت

۹۔سپینرز کی پولٹیکل اکونومی

مولانا حالی نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت جس پر فی الحقیقت سوسائٹی کا دورومدار تھا ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے ذریعہ سے بھی سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا اپنا ذاتی پریس جوانھوں نے آٹھ ہزار خرچ کر کے خریدا۔تبین الکلام اور سوسائٹی کی تمام رودادیں انگریزی اور اردو کاغذات ابتداء سے ہی اسی پریس میں چھپتے تھے جب تبین الکلام کی چھپائی موقوف ہوگئی تو سامانِ پریس ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو دے دیا۔''

سائین ٹیفک سوسائٹی کے اخبار کا اجراء ۱۸۶۶ء میں ہوا اور جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے اپنے آخری ایام تک نکلتا رہا۔سید احمد خان، اس میں مستقل لکھتے تھے۔شاید ہی کوئی معاشرتی ،اخلاقی اور علمی موضوع ایسا ہو جس پر انھوں نے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔اخبار کی باقاعدگی کا یہ عالم تھا کہ بتیس سال کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا نمبر ہو جو اپنی معین تاریخ میں نہ نکلا ہو۔

سوسائٹی کے زیر اہتمام ہر مہینے متعدد لکچرز ہوتے جن میں سائنسی آلات باقاعدہ دکھائے جاتے اور لکچرز کے لیے ایسے موضوعات چنے جاتے تھے جن سے معلومات میں اضافہ ہو اور آزادئ فکر وعمل پیدا ہو۔ڈاکٹر کلکی ہر مہینے ایک لکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور سائنسی آلات دکھا کر تجربے بھی کرتے تھے۔

سوسائٹی کا اپنا ایک مستقل کتب خانہ بھی تھا کتابوں کے علاوہ اس کے دارلمطالعہ میں درجنوں کی تعداد میں رسالے آتے تھے۔سید احمد خاں نے سوسائٹی کی تنظیم اعلیٰ پیمانے پر کی تھی۔اس زمانے میں پانچ سو روپیہ ماہوار عملہ یعنی

مترجمین،مولوی، پریس میں چپراسی مالی پرصرف ہوتا تھا۔اس کے لیے تئیس ہزار کی لاگت سے ایک عمارت علی گڑھ میں تعمیر کی گئی جوموجودہ طبیہ کالج کے دواخانے کے قریب ہےاورزبانِ حال سے ملت کی بےحسی کا ماتم کرتی ہے۔

سائینٹیفک سوسائٹی سیداحمدخاں کی تعلیمی مہم کی ہراول تھی اوراپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی جس سے ہماری قومی زندگی میں فکروعمل کا انقلاب برپا ہوا۔ان کا خیال تھا کہ معاشرہ کی اصلاح اورترقی کی کوئی تدبیراس وقت تک باورنہیں ہوسکتی جب تک کہ عوام کے خیالات میں تبدیلی کے لیے مسلسل اور پرخلوص جدوجہد نہ کی جائے اوران کی قائم کردہ سوسائٹی قوم میں اس مقصد کی سعی وکوشش کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

ادھرچارچھ برس پہلے یونیورسٹی میں سوسائٹی کی تجدید ہوئی جس کے زیراہتمام مختلف موضوعات پرلکچرز ہوئے مگر آج ۱۹۹۲ء میں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم میں سائنسی مزاج (سائنٹفیک ٹمپر کی ترویج زیادہ شدومد سے کی جائے۔)

4.3.5 : تہذیب الاخلاق ''مضمون نگاری''

مضمون نگاری اردونثر کی ایک خاص صنف ہے۔انگریزی زبان میں اسے Essay کہاجاتا ہے۔اس فن کا آغاز اردوزبان وادب میں دہلی کالج سے ہوتا ہےلیکن ارتقائی منزل سرسیداحمدخان اورانکے رفقاء کے ہاتھوں سے اس صنف کوفروغ حاصل ہوا ہے۔مضمون نگاری کی تعریف یوں ہے کہ کسی موضوع پراپنے خیالات کومربوط اور مدلل انداز میں اس طرح پیش کرنا کہ پڑھنے والا اس کوسمجھ کرمتاثر ہوسکے۔دراصل مضمون ایک مسلسل تحریرکا نام ہےجسکی بنیادایک خیال یاموضوع پرہوتا ہے۔تحریرکے ہر بات کا ہر پیراگراف میں مرکزی خیال کی منطقی وضاحت ہوتی ہے۔مضمون میں بات یاخیال کوعالمانہ انداز میں پیش کیاجاتا ہے۔مضمون نگاری کے بنیادی تین اصول ہیں۔

(۱)تمہید

(۲)اصل مضمون

(۳)اختتام

اردوادب میں سرسیدصنف مضمون کے بانی ہیں۔بقول سرسیدخاں کہ''مضمون نگاری'' دوسری چیز ہے جوآج تک اردوزبان میں نہ تھی۔یہ اسی زمانے میں پیدا ہوئی اورابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اورایشائی خیالات کونہ ملائے گی جواب حد سے زیادہ اجیرن ہوگئے ہیں توچندروز میں ہماری ملکی تحریریں بھی

میکالے اور ایڈسن کی سی ہو جاویں گی۔''

یعنی سرسید فنِ مضمون نگاری کی اہمیت سے بہ خوبی واقف تھے اپنی تحریروں کے ذریعہ اس صنف کو خوب پروان چڑھایا۔ سرسید کے تحریروں میں تین طرح کے مضامین ملتے ہیں۔ خاص مذہبی، دینی مضامین، سیاسی مضامین اور اصلاحِ اخلاق و معاشرت سے متعلق مضامین ہیں۔ دراصل سرسید نے اپنی مضمون نگاری کے ذریعہ قوم میں تعلیمی بیداری کا پیغام دیا ہے۔ ملک و قوم کو ایک نئی بیداری پیدا کی ہے سرسید نے قوم کو بیدار کرنے کے لیے بہت سارے اقدامات کئے تھے۔ ان میں ایک اہم قدم رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' ہے۔ چونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ رسالے اور اخبارات کے ذریعے خیالات کی ترسیل اور توسیع ذہنوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں جو باتیں چھپی تھیں وہ پڑھنے والوں کو متاثر کرتی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ سرسید نے عام تقریروں کے بجائے اپنے خیالات کو اخبرات اور رسائل کے ذریعے دوسروں تک پہنچایا۔ اس طرح سرسید نے اردو نثر کو ایک مخصوص صنف سے روشناس کروایا۔

☆ ''تہذیب الاخلاق''

''تہذیب الاخلاق'' سرسید احمد خاں کا ایک نہایت اہم کارنامہ ہے۔ جس کے ذریعے انہوں نے جدید رجحانات کو پیش کر کے عام کیا اور ان تمام موضوعات پر مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے جس کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد، رسم و رواج، اور شاعری موجود صورتِ حال اور معاشی سماجی و سیاسی مسائل سے تھا۔

ان مضامین میں وہ کہیں کہیں انسانی نفسیات کا جائزہ بھی لیتے ہیں لیکن کردار نگاری جو ایڈیسن اور خصوصاً لابرو سے جس کا ذکر سرسید نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، مخصوص ہے، ان کے دائرہ عمل سے باہر رہتی ہے۔ سرسید بھی کردار نگاری کر سکتے تھے لیکن جوشِ اصلاح نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو دبا دیا اور وہ اپنے مضامین میں ایک مصلح کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ یہی ان کی تحریروں کا مقصد تھا اور وہ اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

سرسید ایک ایسے دور کے فرد اور ایک ایسے دور کے بانی تھے جب قوم کو بیدار کرنے کے لیے اس کا رُخ ایک طرف سے ہٹا کر دوسری طرف کرنا ضروری تھا۔ یہ رُخ ادب میں اُس ''ادبیت'' کی زیادتی کا قاطع تھا جو ساری حدوں کو پار کر کے ایک ایسا نشہ بن کر رہ گیا تھا جس میں ''معنویت'' باقی نہیں رہی تھی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کی شاعری اور نثر اسی تخریبی رجحان کی ترجمانی کرتی ہے۔ سرسید کے مضامین اس دور میں نثر کی طرف رجحان پیدا کرتے ہیں اور ادب کو محض لطف و تفریح سے ہٹا کر ''افادیت'' کے دائرے میں داخل کرتے ہیں اور مقصدی و افادی ادب کی بنیاد رکھتے

ہیں۔ یہ نئے دور کا جدید ترین رجحان تھا اور ضرورتِ وقت کے مطابق مقبول ہو رہا تھا۔ سرسید کے ساتھ انگریزی تہذیب وادب کے اثرات ہماری تہذیب وادب میں شامل ہوکر اُسے ایک نئے راستے پر ڈال دیتے ہیں جن پر ہم اور ہمارا ادب آج تک گامزن ہے۔ سرسید سے پہلے اردو ادب میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ انگریزی ادب سے وہ بہت کچھ لیتے ہیں اور پھر اُس میں اپنی طرف سے بہت کچھ ملا کر اُسے ایک نئی صورت دے دیتے ہیں جس سے جدید رجحانات جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ سرسید نے اردو میں مضمون نگاری کا علم بلند کیا، اس کے قلعے کی فصیلیں تیار کیں اور ادب اس میں نئی نئی عمارتیں بنانا اور شجر کاری کرنا آنے والوں کا کام ہے۔ سرسید کی آواز آج بھی ہماری جدید تہذیب، ہمارے کلچر اور ادب کی ممتاز و نمایاں آواز ہے جو پوری طرح ہمارے تہذیبی وفکری وجود میں شامل ہے۔

سرسید احمد خان اور رسالہ تہزیب الاخلاق مضمون نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ اس رسالے کے ذریعے سرسید کی صرف قومی وتعلیمی بیداری کی لہر نہیں ملتی ہے بلکہ سرسید کے ادبی وعلمیت کا گہرا پتہ چلتا ہے۔ انکی منفرد انشائیہ انداز تحریر اور اسلوب نگارش نے اردو ادب کو ایک نئے صنف سے روشناس کروایا ہے۔ سرسید احمد خان کی مضمون نگاری بہ حوالے ''تہذیب الاخلاق'' کے چند اہم خصوصیات ذیل میں یوں ہے۔

(ا) سرسید کے مضامین، بیکسن کے مضامین کی طرح، تہہ دار اور گہرے خیالات کی بناء پر اہم ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، اپنی مخصوص نظر سے، ایسے اقوال Aphorisms پیش کرتے ہیں جو اپنی سچائی کی بناء پر دل میں اُتر جاتے ہیں۔ اقوال سے سرسید کی دلچسپی اس لیے بھی تھی کہ ان سے تعلیم وتربیت کا کام لیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۸ء میں، جب وہ مرادآباد میں تھے، انھوں نے ''پنچایتی مدرسہ مرادآباد'' کے طلبہ کی تعلیم وتربیت کے لیے ''صد پندِ لقمان'' کے طرز پر فارسی زبان میں ایک کتاب بھی مرتب کی تھی جو کم ازکم دو بار ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ اصلاح وتربیت کے لیے اقوال کا استعمال ان کے تخلیقی مزاج کا حصہ تھا اسی لیے ان کے مضامین میں ایسے چست فقرے (اقوال) اکثر سامنے آتے ہیں۔ یہ خصوصیت بیکسن اور سرسید میں مشترک ہے مثلاً:

''انسانوں کی بدبختی کی جڑ دنیوی مسائل کو دینی مسائل میں شامل کرلینا ہے۔''

''کفر سے بھی بداخلاقی زیادہ بدتر ہے۔''

''حسد کا منشا صرف وہ اوصافِ حمیدہ ہوتے ہیں جو محسود میں ہیں اور حاسدان کا خواہاں ہے مگر وہ اس میں نہیں ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔''

سرسید اکثر دوسروں کے اقوال کا بھی اقتباس کرتے ہیں اور انھیں موجودہ صورتِ حال پر منطبق کرکے اصلاحِ

احوال کا درس دیتے ہیں۔

(۲) مضامین سرسید کی دوسری خصوصیت ''تبلیغی جوش'' ہے۔ یہ ایڈیسن کے ہاں بھی ہے اور جونسن کے ہاں بھی مگر یہ دونوں سرسید سے اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ سرسید کی مضمون نویسی کا پہلا مقصد ''اصلاح'' ہے اسی لیے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ وہ وعظ کررہے ہیں۔ واعظانہ رجحان ان کے اکثر مضامین پر غالب رہتا ہے۔

(۳) اسلامی جوش اور ہر نیکی کو صحت کے ساتھ، اسلام سے وابستہ کرنا ان کے مضامین کی خاص صفت ہے۔ مثلاً عورتوں کے حقوق میں لکھتے ہیں:

''جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہبِ اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں۔ انگلینڈ، جو عورتوں کی آزادی کا بڑا حامی کار ہے جب اس کے قانون پر، جو عورتوں کے باب میں ہے، نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لایعقل اور لاشے سمجھا ہے۔''

(۴) تبلیغ کے ساتھ بحث و استدلال کا عنصر بھی سرسید کے مضامین میں نمایاں ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں اس پر بحث کر کے دلیل سے ثابت بھی کرتے ہیں۔ جیسے اپنے مضمون ''تربیتِ اطفال'' میں۔

(۵) مضامین سرسید کا غالب عنصر ''مفکرانہ سنجیدگی'' ہے۔ وہ غور و فکر اور دلائل و براہین کی مدد سے حقایق کو واضح کرتے ہیں لیکن اکثر مضمون خشک، غیر دلچسپ اور بے اثر ہو جاتا ہے مگر ساتھ ہی ان کے بہترین مضامین وہ ہیں جن میں گہری سنجیدگی صفائی خیال کے ساتھ آتی ہے اور ان کے خیالات ہمارے چراغِ ذہن کو روشن کر دیتے ہیں اور ہم بھی غور و فکر پر مائل ہو جاتے ہیں۔ باتیں بظاہر عام سی ہوتی ہیں مگر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھیں۔ بات نئی نہ ہونے کے باوجود ہم اس پہلو سے اسے دیکھنے لگتے ہیں اور یہی سرسید کے مضامین کی کامیابی ہے۔ ان کے مضامین ''ریا'' اور ''خوشامد'' اسی نوعیت کے ہیں۔

(۶) سرسید کے مضامین میں 'نیچر' پر بہت زور ہے مگر یہ نیچر کلاسیکی نیچر ہے، رومانی نہیں۔ زندگی یا نیچر کے تخصیلی اور جذباتی پہلوؤں کا ان کے ہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہ صرف اس نیچر سے تعلق رکھتے ہیں جو اعمالِ انسانی اور شہر کی اجتماعی زندگی اور شائستہ لوگوں کی تقلید سے سروکار رکھتی ہے۔ وہ ''نیچر'' جو انگریزی زبان کے معروف شاعر ورڈزورتھ کے ہاں ملتی ہے وہ سرسید کے دائرۂ فکر سے خارج ہے۔ وہ تخیل جس سے نیچر تعلق رکھتی ہے اور جو قدرتی مناظر، انسان کی بنیادی فطرت، محبت، عشق و عاشقی اور کائنات کے پراسرار اصولوں اور آفاق پہنائیوں میں نمایاں ہوتی ہے وہ بھی سرسید

کے دائرۂ فکر وعمل سے باہر ہے۔ کلاسیکیوں کی طرح ''اصول بندی'' ان کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ''نیچر'' اور ''عقل'' دونوں سرسید کے ہاں ایک ہی چیز ہے یادرہے کہ عقل کی بالادستی سرسید کا مسلک ہے۔

(۷) اس کلاسیکی دائرے سے نکل کر وہ اگر کہیں آتے ہیں تو ان چند مضامین میں جیسے ''امید کی خوشی''، ''گذرا ہوا زمانہ''، ''سرابِ حیات''، آدم کی سرگذشت'' وغیرہ۔ یہاں بھی وہ اس حد تک ''رومانی ہیں کہ وہ ایک موڈ کے تحت اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں مگر ''داخلیت'' اور ''مطالعۂ خودی'' کا وہ عنصر جو چارلس لیمب، ولیم ہیزلٹ اور اسٹی ون سن کے مضامین میں ملتا ہے سرسید کے ہاں اس طور پر نہیں آتا۔ یہی مضامین ان کے ہاں سب سے زیادہ موثر ہیں اور ان مضامین پر ان کی مضمون نگاری کا دوام کا مدار ہے۔ مجھے ڈاکٹر احسن فاروقی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ''امید کی خوشی'' کو اسی طرح اردو ادب کا بہترین مضمون کہہ سکتے ہیں جیسے چارلس لیمب کے 'ڈریم چلڈرن'' کو انگریزی کا بہترین مضمون کہا جاتا ہے۔

(۸) سرسید کے مضامین کا ادبی کیف اسی لیے'' کلاسیکی'' ہے اور کلاسیکی مضمون نگاروں کی طرح ہی وہ ذکاوت، طنز اور خوش طبعی سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ کہیں کہیں ایڈیسن کی خوش طبعی کی پیروی ضرور کرتے ہیں اور یہ اثرات ان کے مضامین مثلاً ''بحث وتکرار'' اور طریقۂ تناول طعام'' میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ سرسید اپنے مضمون ''بحث وتکرار'' کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

''جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جالگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منھ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے چمٹ جاتے ہیں۔''

(۹) ان مضامین میں وہ کہیں کہیں انسانی نفسیات کا جائزہ بھی لیتے ہیں لیکن کردار نگاری جو ایڈیسن اور خصوصاً لابروے سے جس کا ذکر سرسید نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، مخصوص ہے، ان کے دائرۂ عمل سے باہر رہتی ہے۔ سرسید بھی کردار نگاری کر سکتے تھے لیکن جوشِ اصلاح نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو دبا دیا اور وہ اپنے مضامین میں ایک مصلح کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ یہی ان کی تحریروں کا مقصد تھا اور وہ اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

4.4 : خلاصہ

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی ترقی کے جو تحریک چلائی گئی تھیں اسے سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔سرسید نے اس تحریک کا آغاز جنگ آزادی سے قبل کر چکے تھے۔اس سلسلے کی پہلی کڑی سائنٹفک سوسائٹی ہے لیکن آزادی کے بعد اپنوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے کی خامیوں اور خوبیوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔قوم کی تباہی بربادی کا شدید احساس ہوگیا تھا۔ انھوں نے قوم کو بیدار کرنے کے لئے جدید علوم حاصل کرنے کی پُر زور حمایت کی۔غازی پورہ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کا اہم مقصد تھا کہ انگریزی زبان کی اعلیٰ و علمی کتابوں کا ترجمہ کرایا جائیں، تاکہ ہندوستانی مسلمانوں میں ادبی سرمایئے سے استفادہ حاصل کر پائیں۔دراصل سائنٹفک سوسائٹی کا قیام ہی علی گڑھ تحریک کے علمی و ادبی کارناموں کا نقط آغاز تھا۔سرسید کی اس بے لوث خدمات میں ان کے رفقاء نے بڑی جدوجہد کے ساتھ تحریک کی شمع کو روشن رکھا تھا۔ الطاف حسین حالؔی سے لے کر مولوی چراغ علی تک نے علی گڑھ تحریک کو فروغ دینے میں پیش پیش رہے تھے۔دراصل سرسید کا یہ خواب تھا کہ ہندوستانی مسلمان بھی ایک بہتر اور اعلیٰ شہری کی طرح زندگی بسر کرئیں جس کی تعبیر آج ہم سب (ہندوستانی زندگی) کو مختلف شعبوں میں نظر آتی ہے۔علی گڑھ تحریک نے تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، ادبی سماجی، سیاسی اور تمدنی بیداری اور ترقی کے لیے اہم رول ادا کیا ہے۔

4.5 : نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ علی گڑھ تحریک کے تاریخی پس منظر کا تنقیدی جائزہ لیجیے

۲۔ ۱۸۵۷ء کا غدر اور علی گڑھ تحریک پر روشنی ڈالیئے۔

۳۔ علی گڑھ تحریک اہم رفقاء کاروں کی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۴۔ تہذیب الاخلاق اور مضمون نگاری پر سیر حاصل بحث کیجیے۔

۵۔ علی گڑھ تحریک پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4.6 فرہنگ

الفاظ	معنی

رہبر	راستہ دکھانے ولا
سانحہ	اندوہناک واقعہ
معاصرین	ہم عصر/ہم عہد
تفسیر	شرح
رسم الخط	اندازِ حروف نویسی
عظمت	شان وشوکت
تحسین	تعریف کرنا
نگارش	قوتِ خیال
مدافعت	دفعہ کرنا/ بچاؤ کرنا
سلاست	کلام کی نفاست/آسان ہونا۔

4.7 : سفارش کردہ کتابیں

۱۔	سرسیداورعلی گڑھ تحریک	خلیق احمد نظامی
۲۔	علی گڑھ تحریک	عشرت علی قریشی
۳۔	علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ	مظہرمہدی
۴۔	سرسید کی تعلیمی تحریک	پروفیسر اختر الواسع
۵۔	سرسیداحمد خاں اوران کا عہد	ثریا حسین
۶۔	اردو تنقید سب کے لئے	ڈاکٹر بلقیس بیگم

☆☆☆☆☆

Shivaji University Kolhapur

شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور

Humanities

B.A. PART III

بی۔اے۔سال سوم

Syllabus : URDU

Paper No.XII Semester -VI

Paper Name :- Dr.Allama Iqbal

ڈاکٹر علامہ اقبال

Dr.Sabiha Sameeruddin Sayyad

Head of Department Urdu
Night College of Arts & Commerce.Ichalkaranji
Dist.Kolhapur Maharashtra

مصنفہ:۔ڈاکٹر صبیحہ سمیر الدین سیّد

(صدر شعبہ اُردو)

نائٹ کالج آف آرٹس اینڈ کامرس، اچلکرنجی، ضلع کولہاپور

Topic for Study :

Unit 1. Iqbal ke halat-e-Zindagi

a) Iqbal ke daur kadaurkamo' ashera aur shairi

Unit 2. Urdu nazmmein Iqbal Kamaqam-o-martaba.

a) Iqbal ka falsafa -e-Khudi

Unit 3. Iqbal b;haishiyat shair

a) Iqbal ka Ishqu-e-Rasul

Unit 4. Iqbal ki Hubbul Vatni

a) Dr.Allama Iqbal ki Nazmoun ka Mutalia

1) Balad-e-Islam 2) Walida Marhuma ki yaad mein

3) Ek Aarzoo 4) Tulu-e- Islam

5) Tasveere Dard 6) Kizare-e-Rah.

Dr.Allama Iqbal

ڈاکٹر علامہ اقبال

اُردو نظم میں اقبال کا مقام و مرتبہ

اقبال بحیثیت شاعر

اقبال کے حالات زندگی اور معاشرتی شاعری

اقبال کی حب الوطنی اور نظموں کا مطالعہ

Unit-1

اُردو نظم میں اقبال کا مقام و مرتبہ

ا اقبال کا فلسفہ خودی

ا:

اکائی کے اجزاء

1.1 : مقصد

1.2 : تمہید

1.3 : اقبال کا عشق رسولؐ

1.4 : معلومات کی جانچ

1.5 : نمونے کے امتحانی سوالات

1.6 : فرہنگ

1.7 : سفارش کردہ کتابیں

.1 : مقصد

ڈاکٹر علامہ اقبال کے قرآنی تعلیمات کا رچ جانا، وہ دنیا اور دنیا کے ہر مسئلے کو قران کی عینک سے دیکھتے تھے جس کو اس کے مطابق پاتے یا پسند کرتے جسے خلاف پاتے اسے رد کر دیتے سبھی افکار کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا کرتے اور ان کا حل قرآن میں پا لیتے۔ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کی ان تمام خوبیوں سے ذہن نشین کرانا۔

2. : تمہید

اب اس اکائی میں اقبال اور عشق رسولؐ سے سرشار تھے کہیں بھی سرکار دو عالم کا ذکر آ جاتا تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ان تمام خیالات سے متعارف کرانا۔

3. : اقبال کا عشق رسولؐ

ڈاکٹر علامہ اقبالؔ فارسی، اُردو، انگریزی اور عربی سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے عربی و فارسی اس زمانے کے مشہور عالم مولوی سیّد میر حسن سے پڑھی تھی وہ عربی زبان کو صرف معاشرہ کی حد تک نہیں جانتے تھے بلکہ اُنہوں نے ایک زبان کی حیثیت سے عربی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی لئے وہ عربی زبان کے معنی اور مفہوم سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ فلسفے سے ان کی اس دلچسپی کو دیکھ کر پروفیسر آرنلڈ نے بھی اس مضمون کی کھری معلومات دی اس کے ساتھ ساتھ انہیں تاریخ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ یہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے انہیں مذہب اسلام اور اس کی تعلیمات و احکامات وغیرہ سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ انہوں نے مذہب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے گئے تو یورپ کی تہذیب و تمدن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا مغربی یورپ کا بھی گہرا مطالعہ تھا اسلئے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مشرقی و مغربی علوم و فنون کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اسلئے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مشرقی و مغربی علوم و فنون سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ دنیا میں پیش آنے والے اہم انقلابات کو بڑے غور و فکر سے دیکھ رہے تھے زمانے کے بدلے ہوئے حالات پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے دانشوروں اور مفکروں اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا کلام فارسی میں پیش کیا۔ فارسی زبان عموماً دنیائے اسلام میں سمجھی جاتی ہے اور کم سے کم فارسی کے ذریعے وہ بہت سے اسلامی ملکوں میں اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کر سکتے تھے اس طرح اقبال نہ صرف ایک مفکر اسلام تھے بلکہ ایک موجد بھی تھے اور انہوں نے آب سرچشمہ اسلام سے تشنگانِ معرفت کو سیراب کیا ہے ان کو اسلام سے کاٹ کر محض شاعری کی حیثیت کو جاننا اور پرکھنا اور صرف یہ کہنا کہ دنیا اس کے کلام آفاقی اور عالمگیر ہیں روزِ روشن سے انکار کے مترادف ہے۔ اقبالؔ صاف صاف ادنیٰ ترین گنجائش دیے بغیر حقائق اسلام کو اجاگر کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسلامی فکر و نظر کو دورِ حاضر کے سانچے میں ڈھال کر وہی خدمت انجام دی ہے جو ''مثنوی معنوی'' میں ''مولانا روم'' نے صدیوں پہلے کی تھی۔

اقبال عشق رسولؐ سے سرشار تھے کہیں سرکارِ دو عالم کا ذکر آ جاتا تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں عمر کے آخری حج بیت اللہ اور روضۂ منورہ کی زیارت کی آرزو بہت بڑھ گئی تھی۔ مگر شدید بیماری کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتے تھے اقبالؔ بہت رفیق القلب واقع ہوتے تھے ٹیپو سلطان کی مزار پر حاضر ہوئے تو بے اختیار رو پڑے یہی صورت حکیم سنائی کے مزار پر پیش آئی۔ بزرگانِ دین کے مزارات پر تو

ان کی حالت گیر ہو جاتی تھیں تصور کیا جا سکتا ہے کہ روضہ اقدس پر حاضری کا موقع ملا تو وہاں ان کی کیا حالت ہوتی وہاں سے ان کا زندہ لوٹ آنا شدید ممکن نہ تھا۔ فلسفیوں اور حکیموں کی اہم تصانیف کا بھی گہرا مطالعہ کیا اس مطالعے کے بعد ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچے اور دین کے متعلق ان کی دلچسپی اور دین سے محبت کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سالارِ کارواں سے میر حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

مولانا احمد علی صاحب جنہوں نے انجمن اشاعت اسلام کے جلسے کی صدارت کی تھی وہی اقبالؒ کے استاد تھے۔ اقبالؔ نے ان سے تربیت، آیات قرآنی، صنف علماء میں باوجود عربی سے قاصر ہونے کے لئے پڑھتے تھے اور یہ ان کے بزرگ بھی تھے اقبالؔ اپنی شاعری کے ذریعے اسلام پیش کرتے اور اسلام کی تعلیم دیتے اسلام جس دورِ انحطاط سے ذہنی اور سیاسی دونوں طرح پر گذر رہا تھا اس سے وہ بہت متاثر تھے اور وہ ایک طرف اس زمانے کے مفکرین کی طرح اتحادِ اسلام کے ذریعے اسلام کا دنیوی اقتدار واپس لانا چاہتے تھے اور دوسری طرف ملت اسلامیہ میں جو غلط نظریات پیوست ہو گئے تھے ان کے اصلاح کے خواہش مند تھے۔

1.4 : معلومات کی جانچ

☆ اقبال کا تصور عشق پر روشنی ڈالیے۔
☆ ڈاکٹر علامہ اقبال کا مسلکِ عشق پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔
☆ اقبال کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجئے۔

2.5 : نمونے کے امتحانی سوالات :

☆ مختصر نوٹ لکھئے۔
☆ اقبال اور عشق رسولؐ
☆ اقبالؔ اور قرآن

1.6 : فرہنگ

معاشرہ	---	باہمی زندگی بسر کرنا
مفہوم	---	مطلب
احکامات	---	حکم کی جمع (احکام)
مفکر	---	فکر کرنے والا
مفکرانہ	---	فکر کی مانند
فلسفی	---	فلسفہ جاننے والا
فلسفہ	---	حکمت ودانشمندی، علم اشیائے موجودات مع علت واسباب
حجاز	---	نام ملک (مغربی عرب)
انحطاط	---	کم ہونا، نیچے اترنا، گھٹنا
سالار	---	سردار
میر--میر	---	سردار، سید کا قومی لقب

1.7 : سفارش کردہ کتابیں

نئے تنقید زاویے	---	ڈاکٹر خوش حال زیدی
بانگ درا	---	اقبال
ضرب کلیم	---	اقبال
بال جبریل	---	اقبال
فکر اقبال	---	پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم
روحِ اسلام اقبال کی نظر میں	---	پروفیسر غلام عمر خان
ذکر اقبال	---	عبدالمجید سالک

☆☆☆

Unit -2

ا

اکائی کے اجزاء۔

2.1 : مقصد

2.2 : تمہید

2.3 : اُردو نظم میں اقبال کا مقام و مرتبہ

2.4 : خصوصیات کلام اقبالؔ

2.5 : معلومات کی جانچ

2.6 : نمونے کے امتحانی سوالات

3.7 : فرہنگ

3.8 : سفارش کردہ کتابیں

2.1 : مقصد

اُردو نظم میں اقبال کا مقام و مرتبہ اور نظم گوئی سے متعارف کرائیں گے۔ اقبال کی نظم نگاری سے متعلق چند ضروری باتیں اور نظم کا مرکزی خیال، کردار کو واضح کریں گے۔

2.2 : تمہید

اب اس اکائی میں ہم اُردو کے ایک عظیم اور جدید شاعر اُردو نظم میں علامہ اقبال کا مقام و مرتبہ کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

اب اس اکائی میں ہم اُردو کے ایک عظیم اور جدید شاعر اُردو نظم میں علامہ اقبال کا مقام و مرتبہ کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

اقبال اُردو کے عظیم شاعر اور مفکر ہیں جس طرح اقبالؔ نے غزل کے علاوہ مثنوی، مرثیہ وغیرہ اصناف میں اپنا کمال دکھایا ہے

اسی طرح نظم نگار کی حیثیت سے بھی اقبال ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر علامہ اقبال کی نظموں میں مناظر فطرت کی حسین عکاسی ملتی ہے۔انہوں نے بہت سے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ جگنو، پرندے کی فریاد، دردتصویر، والدہ مرحومہ کی یاد میں عقل ودل وغیرہ نہایت دلچسپ نظمیں ہیں ان کی نظموں میں نہایت ہی حسین اورخوبصورت تشبیہیں اوراستعارے ہیں۔ان تمام کے متعلق اقبال کے خیالات سے روشناس کرائیں گے۔

2.3 : اُردو نظم میں اقبال کا مقام ومرتبہ

ڈاکٹر علامہ اقبال نے شعرگوئی کا آغاز اُردو سے کیا ان کی شہرت اُردو شاعر کی حیثیت سے زیادہ ہے چندوجوہات کی بناء پر وہ فارسی شاعری کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ان کی پہلی تین کتابیں فارسی میں ہی شائع ہوئیں آخر ۱۹۲۴ء میں انکا پہلا اُردو مجموعہ کلام ''بانگِ درا'' شائع ہوا۔

ڈاکٹر علامہ اقبال اُردو زبان کے سب سے بڑے نظم نگار ہیں۔نظیر اکبرآبادی کو اُردو کا پہلا عوامی شاعر ان کی نظموں کے باعث کہا جاتا ہے جو نظمیں انہوں نے عوامی موضوعات پر لکھی ہیں اس میں شک نہیں کہ نظم نگاری کی حد تک نظیر اکبرآبادی کو اولیت حاصل ہوئی لیکن جہاں تک اُردو نظم کو اس کی معراج تک پہنچانے کا کام ہے یہ کام اقبالؔ نے کیا ہے؟

اُردو نظم کو ایک باوقار اور بین الاقوامی معیار علامہ اقبال نے دلایا۔انجمن پنجاب کے ذریعہ مولانا محمد حسین آزاد نے اور مولانا الطاف حسین حالی نے غزل کی بجائے نظم نگاری کی طرف توجہ دینے کا مشورہ دیا تھا مولانا الطاف حسین حالیؔ نے اپنی تصنیف ''مقدمہ شعروشاعری میں اُردو غزل پر شدید تنقید کی اور یہ دعویٰ کیا کہ اُردو غزل میں اعلیٰ معیار کی شاعری کی گنجائش باقی نہیں رہی۔مولانا حالیؔ نے اس غزل پر تنقید کی تھی جو غزل لکھنو میں لکھی جارہی تھی۔جس میں نہایت اخلاق سوز موضوعات کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔صفتوں کے فنکارانہ استعمال کے بہانے لکھنو کے دربار سے وابستہ شعراء نے اپنے دماغ کی تمام گندگی کو غزل کے پیمانے میں بھردی تھی۔جس سے مولانا حالی کو غلاظت کی بو آئی تھی حالیؔ نے ایسی تمام شاعری کو دریابرد کرنے کا حکم صادر کردیا تھا۔

مولانا حالیؔ نے ''مقدمہ شعروشاعری میں شعراء کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ نظم نگاری پر توجہ دیں انجمن کے زیراہتمام جو مشاعرے ہوا کرتے تھے ان کی یہ خصوصیت تھی کہ شعراء کو عنوانات دیئے جاتے تھے اور ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ ان عنوانات پر نظمیں لکھ کر لائیں عام طور پر مناظر قدرت پر یا اصلاحی موضوعات پر عنوانات دیئے جاتے تھے انجمن پنجاب کی وجہ سے قومی ،فطری اور اصلاحی شاعری کا ایک قابل قدر سرمایہ نظم کی صورت میں عالم وجود میں آگئی۔علامہ اقبال پنجابی ہیں انجمن پنجاب کی تحریک ان کے بچپن میں اپنے

شباب پر تھی۔اس کے ساتھ ساتھ سرسیّد احمد خاں کی تعلیمی تحریک بھی اورزور پکڑ چکی تھی۔

اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کچھ نظمیں لکھیں جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔'' نالہ یتیم''، فریاد امت''، '' طائر سبز فام کا پیام'' وغیرہ نظموں کی بنا پر انہیں '' قومی شاعر'' کا خطاب دیا گیا۔لیکن یہ صحافتی قسم کی قومی شاعری نہیں ہے اور نہ وہ رسمی شاعری جو آگے چل کر حالؔی اور شبلؔی کے تتبع میں ایک قسم کی ''مرثیہ گوئی'' یا ''روضہ خوانی'' بن کر رہ گئی۔ بلکہ یہ اقبال کے اپنے ذاتی جذبات اور ذہنی تاثرات کا ردِعمل ہے جو خاص قسم کے قومی حادثات کے رونما ہونے پر ان کی زبان وقلم سے ادا ہوئے اور جن میں قوم کے لیے ایک خاص پیغام عمل ہے۔ بقول کلیم الدین احمد'' اقبالؔ کی قومی نظموں کے داعیات واسباب اور ان کا پس منظر ایک سیر حاصل بحث کے محتاج ہیں جن پر مستقل اظہار خیال کی ضرورت ہے۔مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں'' ان کی ابتدائی شاعری قومی اور وطنی قسم کی تھی، لیکن فی الحال اس میں عالمگیر احساسات پیدا ہو گئے ہیں'' وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ مذہب کو اتحاد پیدا کرنے کا بنیادی اصول بنائیں اور اسلاف کی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرلیں، وہ اس دن کا خواب دیکھ رہے ہیں جو عن قریب آنے والا ہے، جب کہ اسلام نہ صرف ایشیاء بلکہ تمام دنیا کی نجات کا باعث ہوتا ہے۔''

ہندوستان کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے سلسلہ میں اقبال کی گراں قدر خدمات کی وضاحت اور تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔مسلمانوں کی بیداری میں ان کی شاعری نے اعجاز مسیحائی دکھایا ہے۔ یہ برصغیر کے مسلمانوں پر اقبال کا زبردست احسان ہے جس کو آزادی ہند کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔مولانا محمد علی مرحوم اپنے انگریزی مضمون میں فرماتے ہیں:

''بحیثیت شاعر اقبالؔ بیسویں صدی کے ہند میں نشاۃ الثانیہ کے علم بردار تھے اور اسلامی ہند اس پنجابی گوشہ نشیں اور شرمیلے بیرسٹر سے زیادہ کسی اور ممنون نہیں۔''

اقبالؔ نے اپنی فکر جدید لطیف طرز بیان اور رنگین اسلوب سے اُردو شاعری میں انقلاب پیدا کردیا، اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے ان کا طرز سخن ابتداء ہی سے اس قدر مقبول ہو چکا تھا کہ معاصر شعرا ان کے طرز واسلوب پر نظمیں لکھنے کی طرف مائل ہو گئے اور اقبال کی شاعری کا آخری دور بعد کے اکثر شاعروں کے لئے نئی تحریکات اور خیالات کی افزائش کا باعث بن گیا۔

3.4 : خصوصیات کلام اقبالؔ

اقبال دراصل اس ادب کے قائل تھے جس سے انسانی زندگی کو سنوارا جاسکے، وہ آرٹ کو محض حصول مسرت کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کو بہتر بنانے کا وسیلہ قرار دیتے تھے، ان کے نزدیک انسانی جدوجہد کا منتہائے مقصد زندگی ہے۔ایک کامیاب، طاقت ور، بامعنی

زندگی اور علم وفن اس کے خانہ زاد ہیں۔اقبال کی شاعری انسان کو جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔

اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ فن کا معجزہ ہے۔حالانکہ ان کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جو شاعری کم اور خطابت زیادہ ہے۔ابتداء میں اقبال کلام کی، اسلوب زبان بیان کی باریکیوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے لیکن آگے یہ توجہ کم ہوگئی تھی۔دراصل وہی شاعری زندہ رہتی ہے جس میں فکر فن بن جاتی ہے، اور فن فکر، سچے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں میں لفظ خیال دونوں موم ہوکر شعر کے سانچے میں ڈھل جائیں۔بڑے فن کار کو خام مواد اور وسیلہ اظہار دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ فنکار ہمیشہ فن کی بلندیوں پر ہی رہے، کبھی فکر پوری کامیابی کے ساتھ فن میں ڈھل جاتی ہے۔کبھی خامی رہ جاتی ہے اور کبھی فن کار کسر نا کام ہوجاتا ہے۔اقبال کا بھی یہی معاملہ ہے جہاں ان کی فکر جذبے میں تحلیل ہوگئی وہاں اعلیٰ درجہ کی شاعری وجود میں آئی۔جہاں ایسا نہ ہوسکا وہاں وہ شاعری ملتی ہے جو صرف ان کے پیغام کے لئے یاد رکھی جائے گی۔اقبال ہر جگہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ پُر اثر بنائے، چنانچہ حسب ضرورت وہ مختلف فنی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

لب ولہجہ اقبال کی شاعری میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔کوئی بات دھیمے لہجے میں کہی جائے تو زیادہ اثر کرتی ہے، کوئی بات اونچی آواز سے ادا ہو تو دل میں گھر کرتی ہے۔کہیں شاعر کو سرگوشی اور خودکلامی کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے تو کہیں راست تخاطب بھی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔اور کبھی اپنی بات کو دوسری کی زبانی بیان کرتا ہے، ان میں اقبال کے کلام میں دوسری اور تیسری آواز سنائی دیتی ہے۔میر کی شاعری کا بڑا حصہ خودکلامی پر مشتمل تھا کہتے ہیں:

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے　　جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

اس کے علاوہ غالبؔ کا معاملہ ان کے برعکس ہے جن شعروں میں وہ خود مخاطب نظر آتے ہیں وہاں بھی یہ گمان کہ محبوب سے باتیں کررہے ہیں۔

آئینہ دیکھا اپنا سا منھ لے کے رہ گئے　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اقبال پیامی شاعر تھے، اور عوام وخواص سب ان کے مخاطب چنانچہ وہ جو کچھ کہتے ہیں بہ آواز بلند کہتے ہیں۔ان کی شاعری دوسری اور تیسری آواز کی شاعری ہے شاعر جو بات کہنا چاہتا ہے اس میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لیے وہ اپنی آواز کو کافی نہیں سمجھتا۔چنانچہ ایسے کردار کی تلاش ہوتی ہے جس کے ہونٹوں سے نکل کر اس کی بات زیادہ دل نشیں اور زیادہ پُر اثر ہوجائے۔تاریخ کے صفحات سے مدد نہ ملے تو وہ خود کردار وضع کرلیتا ہے۔لیکن دونوں صورتوں میں اس کا کام بڑا مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔اگر کردار اور اس کی زبان سے ادا ہونے والی بات میں ذرا سی خامی رہ جائے تو ساری محنت رائیگاں جاتی ہے۔اس سے پہلے کہ کردار زبان کھولے شاعر کو

پوری فضا تیار کرنی پڑتی ہے، مگر بات گل وبلبل کی تمثیل سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ مثلاً :

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سب کر تبسم کیا

اقبال نے البتہ غزل میں بھی شاعری کی تیسری آواز سے کامیابی کے ساتھ پیغامبری کا کام لیا ہے:

جوموجِ دریا لگی یہ کہنے: سفر سے قایم ہے شان میری　　گہر یہ بولا: صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا

اقبال نے اپنی نظموں میں تیسری آواز کا استعمال بہت سلیقہ سے کیا ہے۔ کرداروں کا انتخاب میں انہوں نے موقع اور محل کا بہت لحاظ رکھا ہے۔ اس سے پہلے وہ کردار کی زبان سے اپنا پیغام ادا کریں۔ پورا ماحول تیار کر دیتے ہیں۔ مثلاً خدا سے یہ دُعا کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اونچے حوصلے عطا فرما۔ اس دُعا کے لئے وہ طارق کا انتخاب کرتے ہیں جس نے اپنی مختصر فوج کے ساتھ سمندر پار کر کے اسپین کے ساحل پر جا پہنچا ہے سفینہ نذر آتش کیا جا چکا ہے۔ بے سروسامانی کے عالم میں اس کی نظر خدا ہی کی طرف اٹھتی ہے۔ وہ مجاہدوں کے جوش کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا　　سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیئت سے رائی

لینن جو منکر خدا تھا اور سمجھ بیٹھا تھا کہ ان خستہ حال مزدوروں کا کوئی خدا ہی نہیں جب خدا کے حضور میں پہنچا تو۔

آج آنکھ سے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت　　میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

جب خدا سے اس کا سامنا ہوا تو وہ سوال جس نے اس کو زندگی بھر پریشان کر رکھا تھا۔

جب تک میں جیا خیمہ افلاک کے نیچے　　کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

وہ پوچھتا ہے کہ اے خدا یہ تو بتا آخر تو کس انسان کا معبود ہے؟ تیرے قادر و عادل ہونے کے باوجود اس کی زندگی بڑی تلخ ہے۔

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا معبود؟　　وہ آدم خاکی کہ ہو زیر سماوات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں　　ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

اقبال گدائی کی مذمت کرتے ہیں تو اس کی مذمت کے لئے ایک مرد زیرک وضع کرتے ہیں:

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج　　کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

اقبال نے جن کرداروں کو اپنے پیام کا وسیلہ بنایا اس میں سب سے اہم کردار ابلیس کا ہے۔ ابلیس حرکت کا سرچشمہ ہے اور خود سر و بیباک ہے وہ خدا کے حضور میں لاف زنی سے باز نہیں آتا '' جبریل پر چوٹیں کرتا ہے، آدم کو اپنے زور بیان سے

سے فریب دیتا ہے، خدا سے ہم کلام ہوتا ہے تو اپنی برتری کے لئے دلیلیں دیتا ہے، اپنے اوصاف گناتا ہے۔

اقبال نے ابلیس کی زبان سے جو پیغام ادا کرایا ہے، وہ حرکت وعمل اور سخت کوشی کا پیغام ہے، چنانچہ اس کے لئے ابلیس کا انتخاب اسلئے مناسب ہے کہ وہ روز ازل سے سرگرم عمل ہے۔ وہ ان گنت پیغمبروں کو دیکھ چکا ہے مگر جو راستہ اختیار کر چکا ہے اسے ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔ وہ جدائی میں تڑپنے والوں کا سردار ہے وہ وصل کا نہیں ہجر کا طلب گار ہے کیوں کہ وصل کی موت ہے یعنی بندہ اپنے وجود کو خدا کے وجود میں ضم نہیں کر سکتا۔

خضر بھی ایک اہم کردار ہے جس سے اس تکنیک کے تحت اقبال نے کام لیا ہے۔ اسی طرح اقبال نے تمثیل سے بھی بہت کام لیا ہے۔ حقیقت حسن، چاند اور ستارے، شعاع آفتاب وغیرہ۔

لفظ ومعنی کی مطابقت بھی شاعری میں ایک بڑی اہم منزل ہے، اس کے بغیر اعلیٰ درجہ کی شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ کلام پر نظر ثانی اور نوک پلک کی درستی کی اہمیت سے اقبال اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں اپنے شعروں کو سنوارنے کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں زیادہ صناعی ملتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ توجہ کم ہوتی گئی اور لفظ ان کے کلام میں اپنی فکر آپ کرنا سیکھ گئے تھے۔

اقبال لفظوں کو پرکھنے والے تھے۔ علم موسیقی پر بھی ان کی نظر تھی اور وہ آوازوں کی تاثیر سے پوری طرح واقف تھے ممکن ہے یہ صورت غیر شعوری طور پر پیش آئی ہو لیکن یہ اصلیت ہے کہ ان کے کلام میں صوتی آہنگ نے مطلوبہ فضا تیار کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔

شکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سایہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

یہاں انہوں نے س، ش، ر، کی آوازوں اور ان کی تکرار سے اپنے کلام میں موسیقی پیدا کی ہے۔ غرض یہ کہ موسیقیت کلام اقبال کا خاص وصف ہے۔

اقبال اُردو شاعری کی سب سے توانا آواز ہیں۔ ان کا اسلوب قاری کو اپنے ساتھ آسمان کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ انسان احکام الٰہی پر عمل پیرا ہو کر بندہ مولا صفات بن جائے اور اس کا ہاتھ بن جائے۔ ان کی خواہش پوری ہوئی یا نہیں یہ جدابات ہے لیکن ان کی آواز ربانی ہوگئی۔ جو شاعر کلام اللہ کی تشریح وتفسیر کر رہا ہو اگر اس کا اسلوب قرآنی اسلوب سے متاثر ہو جائے تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کلام میں اقبال میں کہیں لفظوں کے آہنگ سے تو کہیں ردیف وقافیے کے انتخاب سے پیدا ہوا ہے۔

اقبال کے زمانے سے ہی اُردو میں رومانی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ رومای عناصران کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔لیکن ہم ان کو یکسر رومانی شاعر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے یہاں دلا سیکی عناصر بھی ملتے ہیں، رومانی تحریک دراصل حد بڑھی ہوئی عقلیت پسند کے خلاف بغاوت تھی۔ اقبال نے عقل پر عشق کو ترجیح دی ہے، رومانیت انسان کو مرکز کائنات قرار دیتی ہے۔ اس معاملے میں اقبال بھی ان کے ہم نوا ہیں اور انسان کو خلاصہ کائنات سمجھتے ہیں، رومانی فن کاروں کی طرح اقبال کو بھی حسن فطرت سے لگاؤ ہے۔لیکن ابتدائی کلام کے علاوہ اقبال نے فطرت نگاری کو مقصد کے طور پر نہیں بلکہ ذریعہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جب اقبال نے پیامی شاعر کا روپ اختیار کیا تو یہ فطرت نگاری ضمنی ہوگئی۔ جس کی مثال ہم کو ساقی نامہ میں مل جائے گی۔ رومانیت کی اہم خصوصیات انسان دوستی اور داخلیت کلام اقبال میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ رومانی فنکاروں کی طرح آزادی انہیں عزیز ہے۔ رومانی شاعروں کی طرح وہ ماضی پرست نہیں، مادیت اور خالص منطق سے وہ بیزار ہیں، شدید جذباتیت ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ اقبال زندگی سے گریز کے بھی مخالفت ہیں ان کے فن میں کلاسیکیت ہے، ان کا اسلوب کلاسیکی ہے۔ البتہ مروجہ شعری شکلوں میں معمولی ردو بدل کر کے انہوں نے جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔

اقبالؔ کے کلام کی قابل توجہ خصوصیت یعنی ان کی طویل نظموں کے بند غزل کے فارم میں ہیں ذوق وشوق اور خضر راہ جیسی نظمیں اس کی عمدہ مثال ہیں جن کے شعروں پر غزلوں کے شعر ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ اقبال کی نظموں کی مقبولیت میں اس بات کو بھی خاصا دخل ہے۔

رموز علائم کو شاعری میں ہمیشہ سے بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ فلسفیانہ شاعری میں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے، علامت، استعارہ کنایہ اور قصہ وحکایت کا سہارا لے کر شاعر کم سے کم لفظوں میں اپنی بات اپنے مخاطب تک پہنچا سکتا ہے۔ ہر زبان کے شعرواد ب میں ایسے رموز علائم موجود ہوتے ہیں جو کہنے اور سننے والے کے درمیان رابطے کی مختصر زبان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فلسفہ وشعر کی اور حقیقت ہے کیا　　حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

شاعرانہ مصوری میں اقبال کو مہارت حاصل ہے۔ اپنے پیغام میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے وہ ایک مخصوص فضا اور ماحول تیار کرتے ہیں اس مقصد کے لیے وہ عام طور پر مناظر قدرت سے کام لیتے ہیں۔ اور ضرورت کے مطابق کبھی متحرک منظر پیش کرتے ہیں کبھی سکوت اور سناٹے کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کو مسحور کر کے گرفت میں لے لیا جائے، خضر راہ کا آغاز اس کی مثال ہے۔۔۔

ساحل دریا میں اک رات تھا محوِ نظر　　گوشتہ دل میں چھپائے اک جہان اضطراف سے لے کر

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرا ازل　　　چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

خضر کے نمودار ہونے کے لیے ایسی طلسمی فضا ہی درکار تھی۔ نظم کا آغاز ہی سننے والے کو مسحور کر دیتا ہے اور بے یقینی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نظم ''خفتگان خاک سے استفسار میں'' بھی اس کی عمدہ مثال ہے۔

پیکر تراشی سے اقبالؔ نے اپنی شاعری میں بہت کام لیے ہیں۔ ان کے پیکر لمسی اور مشامی سے زیادہ سماعی اور بصری ہوتے ہیں۔

پتیاں پھول کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح　　　دستِ طفل خستہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

چاند جو صورت گر ہستی کا اک اعجاز ہے　　　پہنے سیمابی قبا محو خرامِ ناز ہے

تلمیحات سے بھی اقبال نے اپنی شاعری میں بہت کام لیا ہے تلمیح ایک ایسی فنی تدبیر ہے جس سے لفظوں کی کفایت ہوتی ہے اور شاعر کسی واقعے کی طرف اشارہ کر کے ایک جہانِ معانی تخلیق کر دیتا ہے۔ تلمیحات اقبال کا سرچشمہ، قرآن، احادیث، تاریخ اسلام کے واقعات پیمبروں کی زندگی اور سبق آموز قصص و حکایات ہیں وہ کہیں کلام پاک کی کسی سورت کا صرف حوالہ دے کر اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ کہیں اس سورت کے دو ایک لفظ استعمال کرتے ہیں اور بعض موقعوں پر صرف اشارہ کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ کہیں کسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو کہیں کسی بزرگ کا محض نام لے کر اپنی بات کی صراحت کر دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں تلمیحات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔

کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم　　　علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

غرض یہ کہ اقبال نے مختلف فنی تدابیر کے ذریعے اپنے کلام کو حتی المقدور دل نشیں اور پر اثر بنایا۔ پھر اس شاعری سے اپنے خیالات کی اشاعت کا کام لیا۔

3.5 : معلومات کی جانچ :

- ☆ اُردو نظم میں اقبال کا مقام و مرتبہ بیان کیجئے۔
- ☆ اقبالؔ کے کلام کی خصوصیات لکھئے۔
- ☆ اقبال بحیثیت نظم گو شاعر واضح کیجئے۔

2.6 : نمونے کے امتحانی سوالات :

☆ اُردو نظم گو شعراء میں اقبالؔ کا مقام متعین کیجئے۔

☆ اقبالؔ کے معاصرین کے بارے میں اظہار خیال کیجئے۔

☆ اقبالؔ کے کلام میں علامت نگاری کو پیش کیجئے۔

☆ اقبالؔ بحیثیت پیامی شاعر ہیں، اس پر سیر حاصل بحث کیجئے۔

2.7 : فرہنگ :

بین الاقوامی	--	قوموں کے درمیان
تنقید	--	پرکھنا
غلاظت	--	درشتی ، گاڑھاپن ،موٹاپن ، گندگی
روضہ	--	باغ، سبزہ زار
سلف	--	پہلے کے لوگ، پرکھے، گذشتہ اسلاف (جمع)
پیامی	--	پیامبر
خستہ حالت	--	تھکا ہوا، بیمار ، زخمی
ابلیس	--	شیطان ناامید
خراج	--	زمین محصول، پھوڑا، پھنسی
خرافت	--	بیہودہ باتیں، خرافات (جمع)
کلیسا	--	عیسائیوں کی عبادت خانہ
معبود	--	پرستش کیا ہوا۔
گدا	--	فقیر
یکسر	--	ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک

2.8 : سفارش کردہ کتابیں :

اطراف اقبالؔ -- امیر احسن

کلیات مکاتیب اقبالؔ

(اوّل تا چہارم) -- سید مظفر حسین برلی

انتخاب کلام اقبال سہلؔ -- ضیاء الدین اصلاحی

☆☆☆

اکائی---2

اکائی کے اجزاء

2.1 : مقصد

2.2 : تمہید

2.3 : اقبال کا فلسفہ خودی (فلسفہ خودی)

2.4 : اقبال کا نظریہ

2.5 : خودی

2.6 : اقبال سے قبل فلسفہ خودی

2.7 : فلسفہ خودی کیا ہے۔۔۔

2.8 : معلومات کی جانچ

2.9 : نمونے کے امتحانی سوالات

2.10 : فرہنگ

2.11 : سفارش کردہ کتب

2.1 : مقصد

☆ پچھلی اکائیوں میں علامہ اقبال کے حیات، معاشرہ، شاعری، اُردو نظم میں اقبال کا مقام و مرتبہ سے متعارف کرایا گیا۔

☆ اب اس اکائی میں خودی کا فلسفہ، تعریف، معنی و مفہوم و خودی کس لفظ سے اخذ ہوا ہے۔

☆ ڈاکٹر علامہ اقبال کی فارسی مثنوی اسرار خودی اور رموزِ بیخودی جس میں انہوں نے خودی کے فلسفہ کو پیش کیا ہے روشناس کرانا۔

2.2 : تمہید

اقبال سے قبل فلسفہ خودی۔ فلسفہ خودی کیا ہے۔ خودی کا تصور اقبال کے فلسفہ حیات و کائنات کی بنیاد ہے خودی اقبالؔ

کے نزدیک وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن لفظ ہے جس سے تمام انسانی جذبات وتخیلات روشن ہوتے ہیں۔خودی سے متعلق اقبال کے خیالات سے روشناس کرانا۔

2.3 : اقبال کا فلسفہ خودی

جب علامہ نے ۱۹۱۵ء میں اپنی فارسی مثنوی ''اسرارِخودی'' میں اپنا فلسفہ خودی پیش کیا تو سطحی فہم رکھنے والے نقادوں نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔روایتی تصوف کے دلدادہ لوگوں کو یہ چیز پسند نہ آئی۔ ہماری روایات کے مطابق خودی ایک ناموزوں، ناپسندیدہ شے تھے اور تصوف واخلاق اسے ابلیسانہ صفت سمجھتے تھے۔قدیم لوگوں کے پاس خودی کا مطلب غرور، خود پسندی، تکبر تھا۔ فارسی اور اُردو ادب میں نفس انسانی کے ایزدی جوہر کے متعلق تو بہت کچھ ملتا ہے۔لیکن ہر جگہ تلقین یہی ہے کہ انسان اپنی خودی کو مٹا کر ہی اس جوہر کو اجاگر کرسکتا ہے۔خودی کی پرستش گناہ ہے۔اور خدا پرستی کی مخالفت ہے۔کسی شاعر کا یہ قول مشہور ہے کہ :

تجھ کو خودی پسند ہے مجھ کو خدا پسند　　تیری جدی پسند ہے میری جد پسند

اسی تصور میں یہ ''انا'' یا ''میں''، یا ''ہم'' پندار کا ایک بت ہے اور تمام بتوں کا قلع قمع کرنے کے بعد آخر میں یہی بھاری پتھر معرفت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

گولا کھ سبک دست ہوئے بت شکنی میں　　''ہم'' میں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

وحدت وجود کا فلسفہ جو اسلامی شاعری اور روایات ادب کا مرکز ومحور بنا ہوا تھا زیادہ تر خودی سوز ہی ہے۔کیونکہ اس کے اندر مخلوقات کی حیثیت محض ظلی ہے۔

2.4 : اقبال کا نظریہ

علامہ اقبال اس روایتی تصور خودی کے خلاف تھے وہ روایتی تصوف کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے انہوں نے نفی خودی کرنے والے نظریہ کی نفی کی اور اسرار خودی لکھ کر اس کے خلاف جہاد کا آغاز کیا۔وہ اثبات خودی کے حامی بنے۔نزاعی مسئلہ یہی خودی تھا۔ اقبال خودی کے حامی تھے اور خدا کو خودی میں جذب کرنے کی تلقین کرتے تھے جب کہ تصوف خودی کو خدا میں گم کردینے کی تعلیم دیتا تھا ۔''اسرار خودی'' میں خودی کی حمایت دیکھ کر بہت سے قارئین دھوکا کھا گئے۔وہ سمجھے کہ یہ تو قوت تکبر غرور کی تعلیم ہے اور اس میں انسان کی خودی کو خدا بنادیا گیا ہے اسرار خودی میں خدا کی کہیں نمایاں نہیں۔انسانی خودی خلاق بن گئی۔

2.5 : خودی

اقبال کے فلسفہ خودی کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ خودی کے لفظ یا اصطلاح کے مفہوم کو بخوبی سمجھ لیا جائے ،اور اس کے قدیم وجدید مفہوم کے فرق کو بھی تا کہ اقبال کا اثبات خودی کے پیغام کا مقصد معلوم ہو جائے۔

''خودی'' یہ لفظ ''خود'' سے نکلا ے۔جس کے معنی ہیں ذات خود یعنی خود۔اور اگر بغور دیکھا جائے تو انسان دو چیزوں کا مرکب معلوم ہوتا ہے۔روح اور جسم۔جسم ظاہری ظاہری چیز ہے اور روح پوشیدہ ہے۔جسم اور روح دونوں کا مجموعہ انسان خود ہے۔اس خود کو پہچاننا ہی خودی ہے۔خودی یعنی خود کی پہچان خود کی صلاحیتوں سے آ گاہی انسان کے لئے نہایت ضروری ہے کیوں کہ اس مین ہی اس کی نیابت الٰہی کا راز پوشیدہ ہے۔اور اس کے ارتقاء کا بھی ، کیوں کہ جو خود کو پہنچانے لگا۔خود کی صلاحیتوں سے آ گاہ ہوگا وہی خدا کو پہچانے گا اور وہی اس کائنات پر خدا کی نیابت کر کے حکمرانی کا فرض انجام دے سکے گا۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' یعنی جس نے خود کو پہنچانا اس نے خدا کو پہنچانا۔ایسی ہستی جو خود کی صلاحیتوں سے آ گاہ ہو وہی دنیا کے کاروبار کو صحیح طور پر انجام دے سکتی ہے۔اشیاء کائنات کا صحیح استعمال کر سکتی ہے۔فرد کو نہ پہچاننے والا نیابت الٰہی کا منصب کیسے پہنچانے گا اور زندگی کیسے بسر کرے گا اور ترقی کیسے کر سکے گا۔گویا خودی خود کی صلاحیتوں کا پہنچاننے۔اجاگر کرنے کام میں لانے کا نام ہے۔

4.6 : اقبال سے قبل فلسفہ خودی

انسان کی نظر باطن سے پہلے خارج پر پڑتی ہے۔آنکھ باہری اشیاء کو دیکھتی ہے اور انسان مادی اور حیوانی حیثیتوں سے اپنے ماحول سے دستِ گریباں رہتا ہے۔گردوپیش کی اشیاء اور حوادث کی ماہیئت کو سمجھنا انسان کے لئے تنازع للبقا میں ضروری ہے۔خارجی مطابقت ومخالفت سے فرصت ملی تو انسان سوچے کو میری ماہیئت کیا ہے؟ خارج کو سمجھنے کے کے لئے انسان کے پاس خود اپنے نفع ونقصان اور جبلتوں کے سانچے ہیں۔اس نے فطرت کی قوتوں کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے اور اپنی خواہشوں کے دیوتا بنا لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وجودِ مطلق کی ماہیئت جان سکا نہ اپنی ذات کا اسے اندازہ ہوسکا۔وہ ہستی جسے تسخیر فطرت کی صلاحتیں ودیعت کی گئی تھیں خود فطرت کی قوتوں سے مغلوب ومسخر ہوگئی۔وجود کی حقیقت پہ سب سے پہلے یونانیوں نے بحث کی۔طالیس نے پانی کو وجود مطلق بتایا اور زندہ غیر زندہ میں کوئی فرق نہ سمجھا۔اس کے بعد یونانی مفکر خارج سے باطن کی طرف آتے گئے۔افلاطون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مادہ غیر متحرک اور غیر فاعل ہے۔اور دُنیا کی حقیقت سایہ ہے یعنی جو نظر آتا ہے وہ مایا ہے۔یونانی فلسفہ اور دوسرے خیالات کے زیر اثر اسلام میں وحدت الوجود کا فلسفہ مروج ہوا۔جس نے اقبالؔ کے نزدیک مسلمانوں پر اثر انداز ہو کر مذہب واخلاق کی جڑوں

کوکھوکھلا کر دیا۔سعی وعمل کے ذوق کوفنا کر دیا۔اورانفرادی نفس کو باطل قرار دے کرفرد کی اخلاقی ذمہ داری کے احساس کومٹا دیا۔نتیجہ یہ کہ عالم اسلام زوال پذیر ہوگیا۔

4.7 : فلسفہ خودی کیا ہے۔۔

خودی یاانانیت کا لفظ اُردو میں تکبر وغرور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے،مگر اقبال نے اسے ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے ان کے الفاظ میں اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعین ذات ہے۔فرد کا نفس یا ایغو یا ''انا'' ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے۔لیکن یہ ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے، جو عمل سے پائیدار اور لازوال ہوجاتی ہے۔یہی خودی کا تصور اقبال کے فلسفہ حیات و کائنات کی بنیاد ہے۔خودی اقبال کے نزدیک وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقط ہے جس سے تمام انسانی جذبات وتخیلات روشن ہوتے ہیں۔یہ پُر اسرار شے انسانی فطرت کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔یہ ''انا'' یا ''خودی'' یا ''میں'' جو اپنے اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے یہ کیا شے ہے؟ اس کا جواب اقبال تلاش کرتے تھے۔کیوں کہ اخلاقی اعتبار سے افراد اور اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور اسی سوال کا جواب دنیا کی ہر قوم کے علماء مسلسل تلاش کرتے رہتے ہے۔اقبال نے اس دقیق مسئلہ کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی تا کہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی ہو۔اقبال کے نزدیک کائنات کی اصل ایک وجود بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادے کی قوتیں مضمر ہیں۔کائنات کا وجود یا پیکر ہستی خودی ہی کا نتیجہ ہے۔یوں کہئے کہ وہ خدا ہے۔اور ماسوا کا وجود خدا کی خودی سے سرزد ہوا ہے۔خودی کا اثبات نہیں ہوسکتا جب تک خودی اپنا غیر پیدا نہ کرتی۔خودی کی ماہیت اخلاقی اور ورزش ارتقاء ہے۔وجود بسیط نے اپنے کو خود اور غیر خود میں تقسیم کرلیا۔تا کہ غیر خودی کے مشاہدے کے لیے آئینہ کا اور اس کے عملِ ارتقاء کے لئے معمول کا کام دے۔اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عمل پیہم تشنگی اور کارنوائی میں رہے کائنات میں جس کی خودی جتنی مستحکم ہے اس نسبت سے اس کا درجہ مدارج حیات میں متین ہے۔

پیکر ہستی آثارِ خودی ست ہر چہ میں ہستی ز اسرار خودی ست

اس سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درون حیات خودی کیا ہے بیداری کائنات

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

مخلوقت میں آدم سب سے برتر ہے۔اقبال کے ہاں ذاتِ مطلق کی ماہیت خودی ہے۔خودی ایک انا یا ایغو کے بغیر متصود

نہیں ہوسکتی۔اس مطلق خودی نے ذوقِ نمواور ورزشِ وجود میں اپنے اندر سے لاتعداد یا لغویا خودی کے مراکز خلق کئے۔

خودی کی ماہیت کی جان عرفانِ نفس بھی ہے اور عرفان رب بھی اور ہر انفرادی نفس کی استواری اس کی زندگی کی ضامن ہے۔زورِ خودی سے حیات عالم وابستہ ہے۔اس سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہے۔اس کی برتری کا سبب یہ ہے کہ اس کی ذات میں خودی کا مقصد شعور حاصل ہوجاتا ہے۔جو اسے سب چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔انسان زندگی کو اپنی خودی روز بروز مستحکم کرکے، بسر کرنا چاہتا ہے اس کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان اپنے ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہا ہے۔اپنے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرتا رہے اور انہیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہے۔یعنی جدوجہد میں مصروف ہے۔اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا رکاوٹوں کو دور کرنا مشکلات سے مقابلہ کرنا ان پر غالب آنا ضروری ہے۔اس سے خودی کی آگ روز بروز مشتعل ہوجاتی ہے۔اور ذہنی عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں خودی کی منازل ترقی اس عالم کون ومکاں، زماں ومکاں، کی تسخیر پر ختم نہیں ہوجاتیں بلکہ اس کے ماورا انسان کو نئے نئے میدان بھی نظر آتے ہیں۔

خودی کی ہے کہ منزل اولیں　　مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

خودی کی استواری کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جن ہستیوں نے اپنی خودی کے ممکنات کو وجود پذیر کیا اور اپنی خاک کو رشک افلاک بنایا ان سے عشق پیدا کیا جائے۔اس راہ میں ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ رہنما عشق ہے۔عشق اس مرد کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفت نفس کے مدارج سے گزر کر خود کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔محبت کا دوسرا نام تقلید ہے۔خودی محبت وعشق کے ذریعے قوی تر اور وسیع تر ہوتی ہے، یہاں عشق وتقلید کا مطلب یہ نہیں کہ مقلد اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں کھودے بلکہ یہ ہے کہ اس برتر شخصیت سے تکمیل خودی کا راز سیکھے، ایک لافانی نصب العین کی محبت فانی انسان کو مکمل کرکے اسے لازوال بنادیتی ہے۔

مردِ خدا کا علم عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

طلب ہدایت کے لئے کسی مرد کامل کے آگے سر جھکانا تو خودی کو مستحکم کرتا ہے۔لیکن مال ودولت جاہ ومنصب کے لیے کسی کا دست نگر ہونا اسے ضعیف کرتا ہے۔فقر واستغنا خودی کی سب سے اہم شرط ہے۔سوال اور گدائی کا مطلب دولت جمع کرنے کا ہر وہ طریقہ ہے جس میں انسان کو محنت نہ کرنا پڑے اور وہ دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھائے۔یہی گدائی ہے، گدائی اور فقیری دو الگ چیزیں ہیں گدائی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے اور فقر مادی قوتوں سے بے نیاز کائنات کی قوتوں کی تسخیر فطرت پر حکمرانی اور امن و انصاف قائم کرنا ہے، خودی ایک طاقت ہے اس سے تعمیر وتخریب دونوں کام لئے جاسکتے ہیں۔خودی سے تعمیری کام لینے کے لئے اس کی تربیت، ترتیب ضروری ہے۔بے ترتیب خودی کی مثال شیطان ہے خودی کی تادیب وتہذیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے۔یعنی اس

قانون حیات کی پابندی جوخالق نے ہرمخلوق کے لئے مقرر کیا۔ دوسرا درجہ ضبط نفس ہے۔ یعنی انسان اپنے نفس کی ادنیٰ قوتوں کو قابو میں لائے جوخوصاً نفسانی محبت اور خوف کے جذبات تیسرا درجہ نیابت الٰہی ہے یعنی انسان خدا کا نائب بنے۔ ابتدائی مدارج سے گزرنے کے بعد انسان نیابت الٰہی کے درجہ پر فائز ہوجائے گا جو اس کا وج کمال ہے۔ اسے حاصل کرنا خودی کا اعلیٰ ترین نصب العین ہے جب انسان یہ حاصل کرلے گا تو اس کی قوت تسخیر کی کوئی حد نہیں رہے گی۔ نباتات، جمادات، حیوانات، اجرام فلکی وغیرہ پر اقتدار کے بعد ملائکہ انبیاء اور خدا کے ساتھ ہم کنار ہوسکے گا۔ اسی مقام کے بارے میں اقبال نے کہا ہے کہ:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یعنی ایسے شخص کی مرضی خدا کی مرضی بن جاتی ہے۔ مستحکم خودی والا، اعلیٰ خودی والا، انسان نائب خدا بن کر کائنات کا حکمراں بن جاتا ہے۔ اور تقدیر الٰہی اسی کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ ایسا ہی انسان انسان کامل مرد مومن کہلاسکتا ہے۔

2.8 : معلومات کی جانچ

☆ فلسفہ خودی کے معنی ومفہوم کو واضح طور پر بیان کیجئے۔

☆ فلسفہ خودی کی اہمیت بیان کیجئے۔

☆ اقبال کا فلسفہ خودی پر روشنی ڈالیے۔

4.9 : نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل عنوانات پر نوٹ لکھئے۔

اقبال کا فلسفہ خودی

خودی کا مفہوم

خودی کے متعلق اقبال کا نظریہ۔۔۔

اقبال سے قبل فلسفہ خودی

اقبال کا فلسفہ خودی کو بیان کیجئے۔

2.10 : فرہنگ

انا	---	میں ہم
معرفت	---	جان پہنچان، شناخت، ذریعہ
اصطلاح	---	دوسرے معنی مقرر کرنا
فلسفہ	---	حکمت ودانشمندی
انانیت	---	خودستائی، خودبینی ،خودی
فلسفی	---	فلسفہ جاننے والا، فلاسفہ

2.11 : سفارش کردہ کتابیں

اسرارِخودی	---	ڈاکٹر علامہ اقبال
اسرارِخودی کی شرح	---	یوسف سلیم چشتی
رموزِبےخودی کی شرح	---	یوسف سلیم چشتی
اقبال قرآن کی روشنی میں	---	
ظریف	---	سلیم تمنائی
ادب نما	---	ڈاکٹر خوشحال زیدی۔

☆☆☆

Unit-3

اقبال بحیثیت شاعر

:

اکائی کے اجزاء

3.1. : مقصد

2. : تمہید

3. : اقبال بحیثیت شاعر

4. : معلومات کی جانچ

5. : نمونے کے امتحانی سوالات

6. : فرہنگ

7. : سفارش کردہ کتابیں

3.1 : مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اقبال کی شاعری، نظم گوئی سے متعارف کرائیں۔

i) اقبال بہ حیثیت المرتبت شاعری کے کلام سے روشناس کرانا۔

ii) ڈاکٹر علامہ اقبال کا عشق حضرت محمد ﷺ سے ڈاک

iii) ڈاکٹر علامہ اقبال رسول ﷺ سے سرشار تھے۔

3.2 : تمہید

پچھلی اکائی میں ڈاکٹر علامہ اقبال کے حیات اور معاشرہ وشاعری کی حالات وخوبیوں کو بیان کیا ہے۔
اب اس اکائی میں ڈاکٹر علامہ اقبال بحیثیت شاعر اور عشق رسول کا عمومی جائزہ لیں گے۔

3.3 : اقبال بحیثیت شاعر :

اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور سے متعلق ہماری معلومات بہت ناقص ہیں ظاہر ہے کوئی باکمال شاعری کا یکا یک نہیں بن جاتا اس کے ارتقائی دوریں اس کی استعداد، قابلیت، تحصیل فن کا سراغ ملتا ہے، لیکن ہم اس دور کی تفصیلات سے محروم ہیں، ابتداء میں تو وہ ایک شاعر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جب کہ وہ ملک کے مشہور شعراء کے مقابلہ میں ابھی مبتدیوں کی صف میں تھے۔لیکن اس وقت بھی معاصرین میں ان کی شان سب سے نرالی تھی، تغزل ہو یا منظر نگاری سب میں ان کا انداز جداگانہ تھا۔ابتداء ہی سے ان کا ایک خاص رنگ تھا۔لیکن آگے چل کر پختہ سخن ور بننے کے بعد وہ قومی شاعروں ''حالی، شبلی کے زمرے میں داخل کر دیے گئے، اور ان کی قومی نظموں کی اشاعت کے بعد تو وہ قومی شعرا کی صف میں ایسے بٹھا دئے گئے کہ بزم قومی کے مرثیہ خوانوں میں ان کا بھی شمار ہونے لگا۔مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں: ''اُردو نظم ونثر میں حالی اور آزاد نے جو نئی چھیڑی تھی اقبال نے اس کی تکمیل کی۔ ہم اقبال کو مدرسہ حالی کا مکمل اور تربیت یافتہ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔'' فی الحقیقت اقبال کی دبستان شاعری کے پیرو نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنا دور خود پیدا کیا اور اس لحاظ سے وہ ایک عہد آفرین شاعر تھے۔'' جدید اُردو شاعری'' کے مصنف نے جدید شاعر کا ارتقاء اقبال ہی سے منسوب کیا ہے۔''اقبال اُردو شاعری میں ایک ایسے دور کے موجد ہیں جس کا بڑا وصف رفعت خیال اور فلسفیانہ بلند آہنگی ہے۔وہ جس طرح اپنے عہد کی صداقت شعارانہ پیداوار ہیں اسی طرح فکر وسخن کی تاریخ میں ایک نئے عصر کے معمار ہیں۔''

اگر اقبال نے واقعی کسی شاعر کا تتبع کیا ہے تو وہ مرزا غالب ہیں۔لیکن یہ بھی صرف لفظیات، زبان، بندش، اسلوب اور طرز ادا کی حد تک۔بقول پروفیسر سروری ''یہ سب ابتدائی مرحلے تھے، ان کے بعد کی شاعری جو دراصل ان کی زندگی کا سرمایہ ہے اگلے اساتذہ میں سے کسی سے مناسبت نہیں رکھتی۔'' تعجب تو یہ ہے کہ اقبال نے شاعری وجو اس نے اپنی زبان میں کی ہے، اور زیادہ سے زیادہ ان کی طباعی، مادہ اختراعی، بلند پروازی اور تخیل طرازی کی تعریف کی گئی، ان کی خوبصورت تشبیہات واستعارات کو سراہا گیا نوائی کی داد دی گئی یہ سمجھ لیا گیا کہ ''اقبال شاعری کے لئے اور شاعری اقبال کے لیے پیدا ہوئی ہے''

سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے اقبال کی شاعری کے تین دور تاریخی اعتبار سے مقرر کئے ہیں جن میں اقبال کے شاعرانہ اور دماغی ارتقاء کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر چہ ان ادوار ثلاثہ کا کوئی تفصیلی پس منظر ہمارے سامنے نہیں ہے نہ ان دُعا عیات واسباب سے ہم واقف ہیں جنہوں نے اقبال کو شعر کہنے پر آمادہ کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ اقبال نے محض دوسروں کی دیکھا دیکھی شاعری شروع کی، یا یہ کہ وہ پیشہ ور شاعر بننا چاہتے تھے، یہ کہنا ان کی شاعرانہ عظمت کی توہین ہے، دنیائے شاعری میں قدم رکھنے کے بعد ایک بہترین غزل گو شاعر عہد سے تلمذ (داغ سے) اس کا تتبع، مشاعروں میں غزل خوانی، زبان ومحاورات کی بندش، یہ سب مشق سخن کے لیے ابتدائی مرحلے تھے، دراصل وہ اپنے اظہار خیال کے لئے ایک ذریعہ کی تلاش میں تھے جو انہیں مل گیا، قدرت ان کو اپنے آئندہ مشن کے لیے تیار کر رہی تھی، چنانچہ بہت جلد انہوں نے عام روش کو خیر باد کہا اور فطری شاعری یا منظر نگاری کی طرف مائل ہو گئے چند ہی برس کے بعد ان کی اسلامی شاعری کا دور شروع ہو گیا اور وہ اسلام کے پر شوکت ماضی اور عظمت اسلاف پر شاندار نظمیں لکھنے لگے اور مسلمانوں کے زوال کے مرثیے پڑھنے لگے جس کی وجہ سے انہیں قومی شاعروں کی صف میں بٹھا دیا گیا، حالانکہ وہ عالم اسلام کو اپنا پیغام پہنچانا چاہتے تھے جس کے لئے قدرت نے انکا انتخاب کیا تھا۔

رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ: ''مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصورات تمام کے تمام ان کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں، بڑی غلطی ہے مرحوم کی فکر ونظر کا بہت کم حصہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے شاعری کو پیشہیا فن بنانے کی غرض سے نہیں سیکھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شاعری کو فن کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے، بلکہ فن عروض، معانی وبیان پر ان کی وسیع نظر تھی، اور عربی فارسی، اُردو اور انگریزی ادبیات پر عبور ہونے کے لحاظ سے ان کا ذوق سخن دانی وسخن فہمی بہت بلند ہو چکا تھا، اور یہی سبب تھا کہ اُردو شاعری میں انہوں نے نئی طرح ڈالی، اور ایک عہد آفرین شاعر کی حیثیت سے اس میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

دُنیا کے بڑے بڑے مفکر جنہوں نے بنی نوع انسان کو اپنا پیغام دیا ہے تو عموماً شاعری کو اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ اپنے افکار و خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے شاعری سے بڑھ کر کوئی دلکش اور پر اثر ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اس نکتہ کو اقبال نے سمجھ کر شاعری کو اپنا ترجمان بنایا۔ فرماتے ہیں:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

فطری شاعری :

سب سے پہلے اقبال کی شاعری کی قدر ومنزل فطرت نگاری ہی سے شروع ہوتی ہے اور اس حیثیت سے اُردو کے ہم عصر

شعرامیں انہوں نے بہت جلد ایک بلند مقام حاصل کرلیا۔انگریزی کے فطرت نگار شعراء کے کلام کے ترجمے جوانہوں نے نظم میں کئے اورفطری موضوعات پر جوطبعزاد نظمیں لکھیں ان میں سے اکثر مقتدر رسائل میں شائع ہوتی رہیں،اوران کوکافی مقبولیت حاصل ہوئی یہ نظمیں اکثر ان کے مجموعہ بانگ درا میں موجود ہیں،اس صنف میں انہوں نے اس قدر ترقی کہ کہ وہ تمام معاصرین پر سبقت لے گئے اوران سے بلندتر نظمیں لکھنے لگے۔ان کی فطرت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں''ان کی شاعری میں فطرت نگاری تو ملتی ہے لیکن فطرت پرستی نہیں ہے، جولوگ دنیا سے گھبراتے ہیں یا دنیا کو سمجھنے میں کامیاب کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔اقبال کے یہاں شروع میں فطرت سے بڑی شیفتگی کا اظہار کیا گیا لیکن جیسے جیسے انکی شاعری ترقی کرتی جاتی ہے وہ انسان کومرکزی حیثیت دیتے جاتے ہیں،وہ کسی وقت فطرت کے حسن سے بےخبر نہیں ہوتے،حسن کا تذکرہ ان کے یہاں پہلے تو زیادہ واضح طور پر ہے،مگر آخر میں صرف چند اشاروں پر اکتفا کی گئی ہے۔''لیکن اقبال کی منظر نگاری کواُردو کے بعض نقادان سخن نے اس قدر اہمیت دی ہے کہ وہ اقبال کی بلندرتبہ مفکرانہ شاعری کے مقابلے میں اس کی ترجیح دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، چنانچہ کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب''اُردو شاعری پرایک نظر''میں لکھا ہے۔۔

''جہاں وہ منظر نگاری سے دست بردار ہوئے تو جذبی شاعری کوبھی خیر باد کہا۔کاش اقبال اس طرف توجہ کرتے تو آج اُردو کا دامن نادر ونایاب نظموں سے پُر نظر آتا''''جدید اُردو شاعری'' کے مصنف نے بھی اقبال کی اس صنف سخن کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

''اقبال کی فطری نظموں نے نہ صرف اس میدان کو وسیع کیا بلکہ آئندہ شعراء کے لیے بےشمار راستے کھول دیے ہمالہ،گل رنگین،ابر کہسار،آفتاب،صبح،چاند،صبح کستارہ،وغیرہ منظر نگار مین اقبال کو''مصور فطرت'' کا لقب دیا گیا ہے لیکن جمالیاتی نقطہ نظر سے اقبال کے پورے کلام کا مطالعہ نہیں کیا گیا،صرف اس کی ایک ظاہری صنف کو لے لیا گیا ہے،حالاں کہ اقبال کے اُردو اور فارسی کلام کا اکثر حصہ حسن کاری کا ایک بےنظیر مرقع ہے جوان کے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہے اوراس حیثیت سے وہ مستقل اظہار خیال چاہتا ہے۔

☆☆☆

اکائی--2

اقبال کے دور کا معاشرہ اور شاعری

اکائی کے اجزاء

2.1 : مقصد

.2 : تمہید

.3 : اقبال کے دور کا معاشرہ اور شاعری

.4 : اقبال کا پہلا دور

.5 : اقبال کا دوسرا دور

.6 : اقبال کا تیسرا دور

.7 : معلومات کی جانچ

.8 : نمونے کے امتحانی سوالات

.9 : فرہنگ

.10 : سفارش کردہ کتب

1. : مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ :

☆ ڈاکٹر علامہ اقبال کے دور کا معاشرہ اور شاعری سے واقف کرانا۔

☆ قیام یورپ کے ۱۹۰۸ء میں جب علامہ اقبال واپس ہندوستان آنے کے بعد ان کے نظریات شاعری میں جو تبدیلی آئی یا رونما ہوئی اس سے روشناس کرانا۔

☆ علامہ اقبال کے عہد اور ان کے عہد کی شاعرانہ تاریخ سے واقف ہوں۔

2.2 : تمہید

طلباء پچھلی اکائی میں اُردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر علامہ اقبال تعارف اور ان کی حیات، واقعات اور ذوق شاعری سے فیض یاب ہوئے۔

اب اس اکائی میں ڈاکٹر علامہ اقبال کے دور کا معاشرہ اور خصوصیات شاعری کی نشان دہی کریں گے۔

3. : اقبال کے دور کا معاشرہ اور شاعری :

4. : اقبال کا پہلا دور : (۱۹۰۵ء تک)

ابتداء میں اقبال غزل کہتے تھے لیکن اس دور کی ان کی شاعری میں بھی اس اقبال کی جھلک نظر آجاتی ہے جو آگے چل کر شاعر مشرق، حکیم امت، فلسفی و حکیم بننے والا تھا۔ غزل کے روایتی مضامین کے علاوہ اس دور کی شاعری میں حکمت و فلسفہ کی باتیں، تصوف و اخلاق، کے مضامین نظر آجاتے ہیں، فن کا ارتقاء فکر کی گہرائی پختگی نمایاں ہے۔ ۱۹۰۵ء تک اقبال ایسے شاعر نظر آتے ہیں جو زندگی اور فطرت کے مختلف پہلوؤں سے متاثر ہے۔ جلد ہی اقبال نے تقلیدی اور روایتی شاعری سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ وہ داغ و غالبؔ سے بھی فیضیاب ہوئے اور حالیؔ اور آزادؔ، شبلیؔ سے بھی اور ہر شاعر سے کچھ نہ کچھ لیا۔ اُردو فارسی کے ساتھ انگریزی شاعری کے نمونے بھی ان کے سامنے تھے، وہ قدیم و جدید، مشرقی و مغربی شاعری سے اچھی اچھی باتیں اخذ کر رہے تھے، ان کی ۱۹۰۵ء تک کی شاعری پر انگریزی شاعری کے اثرات نمایاں ہیں۔ غزلوں اور قدیم طرز کی نظموں کے ساتھ انہوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے اور ایسی نظمیں بھی کہیں جن کا انداز و اسلوب تفکر و تاثر انگریزی ہے، مثلاً ''ہمالیہ'' وغیرہ۔ اس دور میں اقبال عقل پر دل کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ہاں فلسفہ خودی کے ابتدائی آثار بھی ملتے ہیں، اس دور میں وہ ایک وطن پرست شاعر ہیں۔ ان کی کئی نظمیں وطن کی محبت میں نہیں جیسے ترانہ ہندی، وہ عالمگیر انسانی اخوت و ہمدردی کے بھی حامی ہیں۔ اس دور کی اہم نظموں میں عقل و دل، مرثیہ داغ، مرثیہ، غالبؔ، شمع، جگنو جیسی بلند پایہ نظمیں ہیں۔ وہ وطن پرست، حقیقت کے متلاشی، فطرت کے شیدائی، اخلاق و حیات کا پیغام دینے والے شاعر نظر آتے ہیں یہ ان کی شاعری کے ارتقاء کی پہلی منزل ہے۔

5. : اقبالؔ کا دوسرا دور (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک) :

یہ قیام یورپ کا زمانہ ہے، اقبال علم حاصل کرنے ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے۔ تین سال قیام کر کے ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔

وہاں انہوں نے یورپ کی زندگی اور اس کی خرابیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ان کا مشاہدہ کیا۔ اقبالؔ مشرقی تھے۔ ان کے مغربی خیالات پر بھی مشرقی روحانیت کا تصور غالب رہا۔ یورپ میں رہنے، حکمتِ فرنگ سے تعلق پیدا ہونے، یورپی تہذیب وتمدن کے مشاہدے وغیرہ سے کئی باتوں سے آگاہ ہوئے اور سمجھ گئے کہ یہ تہذیب خود برباد ہونے والی ہے۔ مغرب کا علم وفن دماغ کی تربیت کرتا ہے مگر دل کو تشنہ رکھ دیتا ہے۔ ان باتوں سے ان کی طبعیت میں فن مغرب کے خلاف زبردست ردعمل ہوا اور وہ اس کے خلاف مصروف جہاد ہو گئے۔ اقبالؔ یورپ میں علمی کاموں میں مصروف ہے۔ اس لئے بہت کم نظمیں کہہ سکے۔ وہاں انہوں نے ہر رنگ کی شاعری کی۔ حسن وعشق کے موضوع پر کچھ اچھی نظمیں کہی ہیں۔ کچھ نظمیں کچھ مخصوص عورتوں کے حسن سے متاثر ہو کر کہی ہیں۔ اس دور کے کلام میں تصوف، فلسفہ، عشق حقیقی ومجازی کی آمیزش ملتی ہے۔ اسلام اور ملت سے محبت کا جذبہ اقبال کے کلام میں یہیں سے آنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے یہاں فلسفیانہ اور پیامی جذبات ملنے لگے۔ علی گڑھ کے طلبہ کے نام پیام عشق، پیام ایسی ہی نظمیں ہیں۔ ان کے یہاں یہ احساس ترقی کرتا ملتا ہے کہ اچھی شاعری پیغمبری کا جزو ہونا چاہیے۔

2.6 : اقبالؔ کا تیسرا دور (۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک)

اقبال کی شاعری کا یہ دور ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی سے شروع ہو کر ۱۹۲۴ء میں بانگ درا کی اشاعت پر ختم ہوتا ہے۔ یہ تاریخ ہندوستان کا پرآشوب زمانہ تھا، اور تاریخ اسلام کا بھی، اس میں طرابلس اور بلقان کی جنگ اور جنگ عظیم اول کے واقعات پیش آئے۔ جس میں ترکی اور عالم اسلام مصائب میں مبتلا ہو کر، ترکی خلافت پارہ پارہ ہو گئی۔ عالم اسلام کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ ان سب باتوں کے اثرات اقبال کی شاعری پر بھی پڑے۔

قیام یورپ کے دوران اقبال کی شاعری میں نمایاں تبدیلیاں آچکی تھیں، وہ اپنی شاعری کا رُخ قومی وملی موضوعات کی جانب موڑ چکے تھے۔ اس دور میں ان کی شاعری میں ایسے موضوعات بکثرت ہیں جن کا تعلق اسلامی دنیا سے اور اس کے مسائل سے ہے۔ انہوں نے ملت کو بیدار کرنے، اسے راہ راست دکھانے، منازل ترقی کی جانب سفر کرنے کی تدابیر سمجھانے والی شاعری شروع کی۔ ملت کے سامنے اس کی گذشتہ عظمت کا بیان کیا۔ اس کی موجودہ حالت، خرابیاں بیان کیا۔ خرابی کے اصلی اسباب بتائے اور اپنی حالت کی درستی، سرخروی، کامیابی ترقی کی تدابیر بیان کیں۔ تاکہ قوم میں خودی، خودداری کا احساس پیدا ہو، جمود توڑتے قوم آگے بڑھے۔

اقبال کا ترانہ ہندی کی طرز پر ترانہ ہندی لکھا۔

چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

''بلاد اسلامیہ'' نظم میں انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کے نمایاں پہلو بیان کئے ہیں۔ جب وہ حیدرآباد گئے تو گولکنڈہ کا شاہی قبرستان دیکھ کر متاثر ہوئے اور ایک نہایت پر تاثیر نظم لکھ کر قوم کی جلالی شاں کے ظہور کی پیش گوئی کی۔اب انہوں نے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کی صداقت وعظمت سے آگاہ کر کے ان کے احساس کمتری کو مٹانا اور ان کے احساس خودی کو بیدار کرنا شروع کر دیا۔

مغرب سے انہوں نے کئی چیزیں حاصل کیں۔لیکن ان کی روحانی طاقت کا سرچشمہ مشرق تھا، اقبالؔ نے مغربی افکار خیالات،طرز زندگی،حکومت، سیاسی چالبازیوں وغیرہ کو بخوبی سمجھا اور ان کی مخالفت شروع کر دی،اب وہ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے شاعر بلکہ ایک مفکر و مصلح بن گئے۔

جنگ طرابلس سے متاثر ہو کر اقبال نے شکوہ، فاطمہ، جواب شکوہ جیسی نظمیں لکھیں جو مسلمانوں کے امڈتے جذبات اور ذہنی ہیجان کی ترجمانی کرتی ہیں ۱۹۱۳ء میں انہوں نے ''شمع وشاعر'' نظم لکھی جس میں فلسفہ خودی کے عناصر ہیں۔ جنگ عظیم اول سے وہ متاثر ہوئے جس نے ملت اسلامیہ کو پارہ پارہ کر کر دیا تھا،مسلمانانِ ہند بھی پریشان حال اور مایوسی وگڑبڑ کا شکار تھے۔ان باتوں اور مسائل سے متاثر ہو کر اقبال نے ۱۹۲۲ء میں ''خضر راہ'' نام کی مشہور نظم لکھی۔اس میں ملت کو پریشان کرنے والے حالات وواقعات مسائل وغیرہ کا جائزہ لیا اور مسلمانوں کو پُر امید رہنے کی تلقین کی۔اس نظم میں اقبال کا فلسفہ رجائیت اور فکر وفن بہترین انداز میں ہے۔ایک سال بعد ہی مصطفیٰ کمال پاشاہ نے انگریزوں کو ترکی سے نکال دیا جس سے عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی،اس خوشی اور مسرت کی ترجمانی اقبالؔ نے اپنی نظم ''طلوع اسلام'' میں کی۔خضر راہ اور طلوع اسلام اقبال کی نہایت مشہور نظمیں ہیں۔ان میں انہوں نے پیغمبرانہ شان سے مسلمانوں کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کی اور ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھ کر ان میں انہوں نے پیغمبرانہ شان سے مسلمانوں کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کی اور ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھ کر انہیں پُر امید بنایا۔اس طرح اقبالؔ نے اس دور میں قومی،ملی، حالات، ومسائل پر اظہار خیال کر کے ملت کے خیالات کی ترجمانی کر کے، ان کے دلوں کو پُر امید بنا کر بڑی خدمت انجام دی۔

اب اقبالؔ ایک قومی وملی شاعر بن شاعر بن گئے تھے۔وہ مسلم قوم میں غیرت،حمیت،خودی،خوداری، جگا کر انہیں سربلند ہونے کی راہیں بتا رہے تھے اور اسی کی فکر کر رہے تھے۔وہ مغربی قوتوں اور تہذیب وتمدن کے طلسم کے تار وپو بکھیر رہے تھے اور قوم کی سربلندی کی راہ بتا رہے تھے اب کی شاعری ایک نئی آواز معلوم ہوتی تھی وہ حکیمانہ اور پیغمبرانہ بن گئی تھی اور آئندہ بلند منزلوں کا پتہ دیتی تھی۔

1.7 : معلومات کی جانچ

عہد اقبالؔ کے تاریخی، سیاسی، سماجی تعلیمی حالات کا احاطہ کیجئے۔ علامہ اقبالؔ کے ابتدائی دور کا معاشرہ اور شاعری پر روشنی ڈالیں۔

1.8 : نمونے کے امتحانی سوالات :

اقبالؔ کے دوسرے دور کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجئے۔

اقبالؔ کے دور معاشرہ اور ان کی شاعری کا عمومی جائزہ پیش کیجئے۔

1.9 : فرہنگ

تقلیدی	---	مقلد، پیرو
تفکر	---	سوچ
تاثیر	---	اثر ڈالنا
شیدائی	---	دیوانگی
شیرازہ	---	کتاب کی جزو بندی

1.10 : سفارش کردہ کتب:

انتخاب کلام اقبال سہیل	---	ضیاء الدین اصلاحی
کلیاتِ اقبالؔ	---	صدی ایڈیشن
اقبالؔ بہ حیثیت شاعر	---	رفیع الدین ہاشمی
اقبال شاعر و مفکر	---	پروفیسر نور الحسن نقوی

☆☆☆

اکائی-4

اقبال کی حب الوطنی

اکائی کے اجزاء

4.1	:	مقصد
.2	:	تمہید
	:	اقبال کی حب الوطنی
	:	آزاد ہندوستان کا خواب
	:	ہندوستانی سادھوسنتوں کا احترام
	:	غلام ہندوستان کی زبوں حالی
	:	فرقہ وارانہ نااتفاقی پرغم کا اظہار
4.8	:	ہندوستانی فکروفلسفہ کا اثر
4.9	:	قوم پرستی کے نظریہ سے بیزارگی
4.10	:	قومی نظریات
4.11	:	دورِاخر کا کلام
7.12	:	معلومات کی جانچ
	:	نمونے کے امتحانی سوالات

4.1 : مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کے وہ اقبال کی شاعری میں قومی یکجہتی اور حب الوطنی سے متعارف کرائیں۔

4.2 : تمہید

پچھلی اکائی میں اقبال کے ادوار کے بارے میں روشناس کرایا گیا۔اب اس اکائی میں علامہ اقبال کے قوم پرستی قومی یک جہتی اور قومی فکر ونظریات کے بارے میں نشان دہی کریں گے۔

4.3 : اقبآل کی حب الوطنی

اپنے ملک وطن سے محبت کا جذبہ آفاقی اور عالمگیر ہے۔دنیا کی ہر زبان میں شعروادب میں وطن سے محبت جذبات ملتے ہیں۔چنانچہ اُردوشعروادب حب الوطنی سے خالی نہیں ابتدائی دور کی شاعری میں وطن سے محبت کا یہ جذبہ محدود تھا۔قدیم داستانوں اور قصہ کہانیوں میں حب الوطنی کے جذبات کی جھلک ملتی ہے۔

''مولانا الطاف حسین حآلی'' ہماری زبان وادب کے پہلے شاعر ہیں۔جنہوں نے حب الوطن کے محدود تنگ مفہوم کو واضح کیا۔ان سے قبل وطن سے محبت کا یہ جذبہ صرف اتنا ہی تھا کہ انسان کو اپنے پیدائشی مقام سے محبت ہوتی ہے۔محبت سے وطن کا یہ جذبہ محدود تھا۔مولانا حآلی نے اس سے آگے بڑھ کر یہ تصور پیش کیا کہ وطن اور اہل وطن کی وفائی خیر وخواہی،خوشی وترقی کے لئے جدوجہد کرنے کا نام حب وطن ہے۔مولانا حآلی نے حب وطن کا نیا دستور پیش کیا۔وہ پہلے شاعروں کے اس دستور کو اپنالیا۔اوراپنے کلام میں وطن سے محبت کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی۔

۱۹/ویں صدی کا آخر یا ور ۲۰ ویں صدی کا ابتدائی دور ایسا ہے جس میں حب وطن کا یہ جذبہ زیادہ شدت اختیار کیا کیونکہ اس دور میں بہت سے شعراچکبستؔ اور اقبال نے تحریک آزادی کی پر جوش حمایت شروع کی۔ان میں علامہ اقبآل کا نام سرفہرست آتا ہے۔ علامہ اقبآل کو دیگر شعراء کی طرح اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔وہ غلامی سے نفرت کرتے تھے۔انہوں نے آزاد ہندوستان کا خواب دیکھا تھا۔وہ جو چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان کے درمیان اتحاد واتفاق پیدا ہو۔وہ دونوں قومیں متحد ہوکر انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑے۔وہ ہندوستان کے سادھو،سنتوں،دانشوروں،مفکروں اور فلسفیوں سے عقیدت ومحبت سے پیش آئے۔ان کا کہنا تھا کہ اگر مسلمان آزاد ہو جائے تو اس کا اثر تمام براعظم ایشیاء پر ہوجائے گا وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان جلد سے جلد ایک آزاد ہندوستان بن جائے۔وہ ہندوستان کی آزادی جہالت،رسوائی،نفرت ونا اتفاقی سے سخت ناراض تھے۔اس بیزارگی کا بیان انہوں نے اپنی نظم میں کیا ہے۔ان کی وطن سے محبت کا جذبہ ان کے کلام میں شروع سے ہی دیکھا جاتا ہے۔یہ جذبہ ان کے کلام میں آخری وقت تک محفوظ رہا۔ بہرحال وہ ایک حب وطن شاعر تھے۔ان کے مختلف ثبوت ان کے تصانیف اور کلام پاک سے کئے جاتے ہیں۔

4.4 : آزاد ہندوستان کا خواب

علامہ اقبآل اپنی زندگی میں کبھی جیل نہ گئے لیکن ان کے خط کے ایک اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے اپنے وطن کی آزادی کے

لئے آخری عمر میں بھی صحت کی خرابی کے باوجود جیل جانے کو تیار تھے۔

۱۷/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو انہوں نے محمد علی جناح کو ایک خط لکھا کہ جس میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ''ذاتی طور پر کسی ایسے امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہے۔ میں جیل جانے کے لئے آمادہ ہوں۔ اس اقتباس سے کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ علامہ اقبال ہندوستان کو آزاد دیکھنے سے کس قدر خواہش رکھتے تھے۔ اس لیے قید خانے کی تکلیف دہ زندگی کو بھی برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔

4.5 : ہندوستانی سادھوسنتوں کا احترام:

علامہ اقبال کے دل میں ہندوستان سادھو، سنت اور مذہبی رہنما کے مطابق عقید ومحبت اور احترام کے جذبات تھے۔ وہ ایک سچے ہندوستانی کی طرح ان مذہبی رہنما اور سنتوں سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور ان کی نیک تعلیمات سے متاثر تھے۔ اس لئے انہوں نے ان کے متعلق اپنے کلام میں عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے۔ جس کی مثالیں ''بانگ درا'' کی نظموں میں ملتی ہیں۔ جو مثال کے طور پر گرونانک، مہاتما بدھ وغیرہ سے پتہ چلتا ہے۔

4.6 " غلام ہندوستان کی زبوں حالی :

انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں ہندوستان اور ہندوستانی عوام کو بری طرح لٹا ہے۔ انہوں نے یہاں کئی گھریلو صنعتوں کو تباہ وبرباد کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیگر ہندوستانی اور فن کار بے روزگار ہو گئے۔ مالی حالت دن بدن گرگئی غریبی ومفلسی عام ہوگئی۔ ہندوستان میں جہالت بڑھ گئی۔ کیا ہندو کیا مسلمان، عوام کی اکثریت جاہل تھی۔ اس جہالت نے بے شمار اخلاقی وسماجی کمزوریاں پیدا کر دی تھی۔ مثلاً آپس میں نا اتفاقی تھی۔ ہمیشہ جھگڑے اور فساد ہوتے رہتے تھے۔ شراب نوشی، جوا، رشوت خوری عام ہو چکی تھی۔ بیکار اور فضول رسم ورواج کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہندوستانی عوام، غلامی، ذلت، رسوائی، غریبی ومفلسی کا شکار تھی۔ اس پر حیرت یہ ہے کہ انہیں اپنی ذلت ورسوائی کا احساس نہیں تھا۔ اقبال جیسا ایک دردمند شاعر اس حالت کو دیکھ کر بے چین اور بے قرار ہو گئے وہ ہندوستانی عوام کو خوشحال اور متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی بیشتر نظموں میں آپس میں پیار ومحبت اور یکجہتی کا پیغام دیا۔ مکار انگریزوں کی سازشوں اور چال بازیوں سے آگاہ کیا۔ غلامی، نفرتو بیزارگی کا اظہار کیا۔ آخر میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی آزادی کا نعرہ دیا۔ اقبالؔ کی اس تڑپ اور دردمندی کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے۔

نا سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والوں

تمہاری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں

4.7 : فرقہ وارانہ نااتفاقی پر غم کا اظہار:

علامہ اقبالؔ ایک دردمند ہمدرد، روشن خیال اور فراغ دل انسان تھے۔ان کے دل کی آرزو تھی کہ ہندو مسلم مل جُل کر پیار و محبت کے ساتھ رہیں۔ دونوں اس ملک کی آزادی، ترقی اور خوش حالی کے لئے کام کریں۔مگر جب انہوں نے دیکھا کہ انگریز مکر و فریب سے کام لے کر دونوں فرقوں کے لوگوں کو آپس میں لڑا رہے ہیں۔انہیں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنا رہے ہیں۔تمام ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کھڑے کر رہے ہیں۔تو یہ دیکھ کر انہیں بہت دکھ ہوا۔اس دکھ اور غم کا اظہار انہوں نے اپنی نظموں میں لکھا ہے۔مثلاً ''شمع اور شاعر''، ''صدائے درد'' ان نظموں کو پڑھ کر ان کے غم کا اندازہ ہوسکتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہندو مسلم فسادات کو ناپسند کرتے تھے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے وطن اہل وطن سے کس قدر ہمدردی و محبت رکھتے تھے۔

4.8 : ہندوستانی فکر و فلسفے کا اثر :

فلسفہ اقبال کا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔اتفاق سے انہیں پروفیسر آرنلڈ جیسا استاد نصیب ہوا۔انہوں نے فلسفے میں طالب علم کی دلچسپی اور شوق کو دیکھ کر بڑی محنت کے ساتھ فلسفے کی تعلیم دی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ اقبال کو فلسفے میں مہارت اور پختگی حاصل ہوئی۔انہوں نے مشرقی فلسفیوں کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفیوں کا بھی مطالعہ کیا۔اس لئے ان کی شاعری میں گہرے فلسفیانہ خیالات ملتے ہیں۔روح، کے لافانی ہونے کا نظریہ وغیرہ ہندوستانی فلسفے کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔اس کے لئے ان کی مشہور نظم ''جاوید نامہ'' میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان پر مہاتما بدھ کے تعلیمات کے اثرات نظر آتے ہیں۔انہوں نے اس شاعر کے یہ خیال کو مندرجہ ذیل میں بیان کیا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر

ظاہر ہے کہ جس شاعر کے دل میں اپنے وطن سے محبت کرنے کا جذبہ ہوگا وہی اہل وطن فلسفی، مفکر، دانشور اور شاعر وغیرہ سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتا ہے۔

4.9 : قوم پرستی کے نظریہ سے بیزارگی:

علامہ اقبالؔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔تین سال تک یورپ میں رہ چکے تھے۔اس دوران انہیں یورپ کی عوام کو قریب سے

دیکھنے کا موقع ملا۔مغربی تہذیب وتمدن کو دیکھنے پرکھنے کا بھی موقع ملا۔مغربی تہذیب کی خامیوں اورخوبیوں کو سمجھا۔اور سیاسی،سماجی تعلیمی،اقتصادی حالات سے باخبر ہوگئے تھے۔انہوں نے دیکھا تھا کہ یورپ کی مختلف قومیں نسلی برتری کا شکار ہے۔رنگ ونسل کے نام پرایک دوسرے کے ساتھ جنگ کررہے تھے۔طاقتورقوم کمزورقوم کواپنا غلام بنانا چاہتی تھی۔ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی مختلف قومیں،نفرت،حسداورنسلی برتری کے سبب ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔مختلف گرہوں میں بٹی ہوئی تھی۔انسانیت کا دامن تارتار ہوچکا تھا۔علامہ اقبال نے یہ سب کچھ یورپ میں دیکھا اوراس کو دیکھنے کے بعداس کا دردمند دِل تڑپ اٹھا۔انہوں نے اس تباہی وبربادی کی اصل وجہ جان لی تھی۔

4.10 : قومی نظریات

علامہ اقبال نے اس نظریہ کی سخت مخالفت کی اس کی بجائے انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک نیا نظریہ ''اسلامی وطنیت'' کا تصورپیش کیا۔واضح اورصاف الفاظ میں کہہ دیا کہ تمام عالم،مسلمانوں کاوطن ہے۔زمین کا کوئی خاص علاقہ،خطہ،ٹکڑامسلمانوں کا وطن نہیں ہوسکتا۔کیوں کہ اگرمسلمان زمین کے کسی خاص ٹکڑے کو مانگ لیتے تو ملت اسلامیہ الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ جائے گی۔ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان، پاکستان،چین،عرف وایران،افغانستان،ترکستان،افریقہ،روس،وغیرہ ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کا مذہب ایک ہی ہے۔وہ ہے''اسلام'' دنیا کے تمام مسلمان ایک قوم،ایک ملت کی حیثیت رکھتے ہیں اسی لئے مسلمان ٹکڑوں میں نہ بٹ جائیں۔انہوں نے قوم پرستی کے نظریے سے بیزارگی کا اظہار کیا ہے اس کے خلاف انہوں نے ایک نظم لکھی ہے جو کافی مشہورومقبول ہوئی جس کا نام ترانہ ملی ہے۔جس کا پہلا شعر یوں ہے:

4.11 : دورِآخر کا کلام :

علامہ اقبال کے کلام میں حب الوطنی کا جذبہ شروع ہی میں نظرآتا ہے عمراوروقت کے ساتھ یہ جذبہ بڑھتا گیا یہاں تک کے دورِآخر میں یہ جذبہ بے حد شدت اختیار کرتا گیا۔''ارمغان حجاز'' میں بیشتر نظمیں ان کے جذبہ حب الوطنی کی ترجمانی کرتی ہے انہوں نے اس مجموعے میں ایک طویل نظم لکھی جس میں جن خیالات کا اظہار ہے ان میں سے خاص واقعات اس طرح ہیں ہندوستان کے مشہورفلسفی ''وشوامتر'' سے ملاقات،ہندوستان کی فریادکرنا۔غدارانِ وطن،میرجعفراورمیرصادق کا خون کے سمندر میں غرق ہونا اورشنکر شاعری ''بھوتری آری'' سے ملاقات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔یہ واقعہ اگرچہ ترقی اورتمثیلی ہے مگران کے پیچھے حب الوطن کے جذبات پوشیدہ ہیں۔آخرکاران واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال دیگرشاعروں سے کئی زیادہ ایک محبّ وطن شاعر تھے۔

اکائی4

ڈاکٹر علامہ اقبال کی نظموں کا مطالعہ

اکائی کے اجزاء

4.1:.. مقصد

4.2 : تمہید

4.3 : نظم کی تعریف ومفہوم

4.4 : بلاد اسلامیہ

4.5 : خلاصہ

4.6 : تشریح

4.7 : معلومات کی جانچ

4.8 : نمونے کے امتحانی سوالات

4.9 : فرہنگ

4.10 : والدہ مرحومہ کی یاد میں

4.11 : خلاصہ

4.12 : تشریح

413. : معلومات کی جانچ

4.1 : نمونے کے امتحانی سوالات

4.15 : فرہنگ

4.16 : ایک آرزو

4.17 : خلاصہ

4.18 : تشریح

4.19 : معلومات کی جانچ

4.20 : نمونے کے امتحانی سوالات

4.21 : فرہنگ

4.22 : طلوع اسلام

4.23 : خلاصہ

4.24 : تشرح

4.25 : معلومات کی جانچ

4.26 : نمونے کے امتحانی سوالات

4.27 : فرہنگ

4.28 : تصویر درد

4.29 : خلاصہ

4.30 : تشریح

4.31 : معلومات کی جانچ

4.32 : نمونے کے امتحانی سوالات

4.33 : فرہنگ

4.34 : خضر راہ

4.35 : خلاصہ

4.36 : تشریح

4.37 : معلومات کی جانچ

4.38 : نمونے کے امتحانی سوالات

4.39 : فرہنگ

4.40 : سفارش کردہ کتب

4.1 : مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ نظم کی تعریف اور اس کے مفہوم کی وضاحت کریں۔

☆ اقبال کی نظم گوئی سے واقف کرائیں۔

☆ بلاد اسلامیہ، والد محترمہ کی یاد میں ایک آرزو، طلوعِ اسلام، تصویر درد، خضر راہ، مندرجہ بالا نظموں کے مرکزی خیال کی نشان دہی کریں۔

☆ اقبال کی نظموں کا عمومی جائزہ لیں۔

☆ نظموں کی خصوصیات کی تشریح کریں۔

بلاد اسلامیہ والدہ مرحومہ کی یاد میں، ایک آرزو، طلوعِ اسلام، تصویر درد۔

4.2 : تمہید

اب اس اکائی میں، اُردو کی ایک اور مشہور صنف سخن ''نظم'' سے آپ کو متعارف کرائیں گے۔ اس سلسلہ میں اکائی کے آغاز میں نظم کی تعریف کرتے ہوئے اس کے آغاز اور اس کے مضامین وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اُردو کے چند مشہور نظم نگاروں کے نام بھی بتائے گئے ہیں۔

اس اکائی میں اُردو کے ایک نہایت مقبول نظم نگار شاعر ڈاکٹر علامہ اقبال کا تعارف کراتے ہوئے ان کی نظموں کی تشریح خلاصہ، خصوصیات سے متعاف کرانا/ بتائی گئی ہے۔

4.3 : نظم کی تعریف و مفہوم

نظم کا لفظ عام طور سے، نثر کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور جملہ اصنافِ شعری کو بھی ''نظم'' کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل، رباعی اور دیگر اصناف شعری نظم کے تحت آتے ہیں اور شاعری کی محض ایک صنف کو بھی ''نظم'' کہتے ہیں جسے عام طور پر، غزل کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ بیاں نظم سے ہماری مراد یہی مخصوص صنف سخن ہے۔

غزل کی ہسیت مخصوص ہوتی ہے اس کے سارے اشعار میں ایک ہی ردیف و قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے لیکن خیال یا مضمون کے اعتبار سے غزل کے اشعار ایک دوسرے سے بہت کم مربوط ہوتے ہیں۔ غزل کے برخلاف نظم کی ہسیت مخصوص نہیں ہوتی لیکن اس کے اشعار میں خیال یعنی مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے کیوں کہ نظم کسی ایک موضوع پر کہی جاتی ہے۔

اُردو میں نظم نگاری پر نظیر اکبر آباد نے بھر پور توجہ دی۔ نظیر کے بعد محمد حیسن آزاد و الطاف حسین حالؔی کا شمار، اُردو نظم کے معماروں میں ہوتا ہے جنہوں نے پہلی مرتبہ لاہور میں نئی طرز کے مشاعرے منعقد کیے۔ قدیم طرز کے مشاعروں میں کوئی طرحی مصرعہ

دیا جاتا تھا اور تمام شعراء اسی مصرعہ کے ردیف وقافیہ میں اپنی اپنی غزلیں پیش کرتے تھے۔اس کے برخلاف ان مشاعروں میں کوئی موضوع تجویز کیا جاتا تھا۔جس پر تمام شعراء نظمیں کہتے تھے جہاں شعراء صرف نظمیں پیش کرتے ہیں اسے شعری اصطلاح میں ''مناظمہ'' کہا جاتا ہے۔

آزاد حالی، کے بعد اسماعیل میرٹھی، چکبست، سرور جہاں آبادی، اقبالؔ اور دوسرے شعراء نظم نگاری کو بہت زیادہ ترقی دی ہے۔

4.4 : بلاد اسلامیہ

بلاد اسلامیہ

سرزمیں دلی کی مسجودِ دل غم دیدہ ہے ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستان کی نہ ہو کیونکر زمیں! خانقاہ عظمت اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیرالامم کے تاجدار نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمی محفل کی یاد
جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہاں آباد بھی اس گرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیب حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوش ارم جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبر کے قدم

جس کے غنچے تھے چمن ساماں وگلشن ہے یہی!
کانپتا تھا جن سے روما، ان کا مدفن ہے یہی!

ہے زمین قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثل شمع طور
بجھ کے بزمِ ملت بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی

قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ غناک ہے

خطہ قسطنطینہ، یعنی قیصر کا دیار مہدی امت کی سطوت کا نشانِ پایدار
صورتِ خاک حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے آستانِ مسند آرائے شہ لَولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا

اے مسلماں ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر!
سیکڑوں صدیوں کی کشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو ، مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ — دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہیے مانندِ نگیں — اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظمؐ کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے — جانشیں قیصر کے ، وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیت اسلام پابند مقام — ہندی ہی بنیاد ہے اس کی ، نہ فارس ہے، نہ شام
آہ! یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماوی ہے تو — نقطہ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں ، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

[39] ''بلادِ اسلامیہ'' خلاصہ

اس نظم میں اقبالؔ نے عالم اسلام کے پانچ بڑے اور اہم شہروں کا ذکر کیا ہے۔ جو بالترتیب دہلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ اور مدینہ منور ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے مذکورہ بالا تاریخی اور عظیم شہروں کی تاریخ نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں بیان کی ہے اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اثر میں ڈوبا ہوا ہے اور پوری نظم از اول تا آخر اثر آفرین ہے۔ ان کے مدنظر یہ مقصد تھا کہ مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگاہی حاصل کریں تاکہ ان کے دلوں میں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو پیدا ہو اور وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح بہادر، حوصلہ مند، پرجوش اور سچے و پکے مسلمان بنیں۔ یہ نظم پانچ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر شہر کے لئے ایک الگ بند مخصوص کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نظم کا پہلا بند ہشر دہلی کے بارے میں ہے جس کا مختصر خلاصہ ذیل میں درج ہے۔

4.6 : تشریح

۱) شہر دہلی مسلمانوں کے نزدیک بے حد اہم شہر ہے۔ کیونکہ اس کے ذرّے ذرّے میں ان کے اسلاف کا خون شامل ہے یہ شہر مسلمانوں کے عظمت رفتہ کا نشان ہے اس کی خاک میں عظیم حکمران اور اولیائے اکرام فرما رہے ہیں۔ اسی شہر میں نو مسلمانوں کی فن تعمیر کے اعلیٰ نمونے جیسے لال قلعہ، جامع مسجد اور قطب مینار گذشتہ شان وشوکت کی یادگار بنے کھڑے ہیں اس شوہر کی خاک میں اپنے وقت کے بڑے بڑے عالم، شاعر و ادیب، صوفی اور ولی اللہ، دانشورانہ مفکر اسلام آرام فرما رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ شہر

دہلی کی سرزمین کے چپے چپے پر مسلمانوں کی یادگار قائم ہیں۔

۲) اس بند شہر بغداد کا ذکر کیا گیا ہے یہ شہر بھی ہمارے اسلاف کی شان وشوکت اور جاہ وجلال کی زندہ یادگار ہے اس کی مٹی مسلمانوں کے نزدیک خاک جنت سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ اس کی خاک میں اپنے وقت کے صوفی، ولی اللہ عالی و فاضل اور بزرگان دین ابدی نیندسو رہے ہیں۔اس شہر کو رسول پاکؐ کے جانشینوں نے آباد کیا تھا اور بڑی شان وشوکت اور جاہ جلال کے ساتھ حکومت کی تھی۔

رسول پاکؐ کے جانشینوں نے آباد تھا اور بڑی شان وشوکت اور جاہ جلال کے ساتھ حکومت کی تھی۔ رسول پاکؐ کے جانشینوں سے مراد عباسی خلیفہ ہیں۔اس خاندان کے حکمرانوں کے نام سے بڑے بڑے عیسائی حکمران کانپتے اور لرزتے رہتے تھے شہر بغداد زمانہ ماضی میں مسلمانوں کے علم وفن کا ایک اہم مرکز تھا۔

۳) تیسرا بند شہر قرطبہ کے بارے میں ہے اقبالؔ اس شہر کو امت مسلمہ کی آنکھوں کا نور کہا ہے کیونکہ یہاں کے حکمرانوں نے اس شہر میں علم وفن کے بڑے بڑے مدرسے، مکتب اور مرکز قائم کیے تھے۔شہر قرطبہ کی درسگاہوں سے علم کی روشنی پھیلائی جاتی تھی۔اس زمانے میں یورپ جہالت کا شکار تھا۔ یوروپین ممالک کے نوجوان عیسائی اور یہودی علم وحکمت حاصل کر کے اپنے وطن چلے جاتے اور وہاں علم کی روشنی پھیلاتے تھے۔ یورپین ممالک میں قرطبہ کے مدرسوں کا علم کا اُجالا پھیلا ہے اگر مسلمان ایسے مدرسے قائم نہ کرتے اور پُرانے وقدیم علوم وفنون کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ نہ کرتے تو قدیم علوم وفنون مٹ گئے ہوتے۔ یہ مسلمانوں کا احسان ہے کہ انہوں نے قدیم علوم وفنون کو زندہ رکھا اور دنیا کو علم کی روشنی عطا کی۔

۴) چوتھا بند ہشر قسطنطنیہ کے بارے میں ہے دنیا کے مسلمانوں کی نظروں میں سرزمین قسطنطنیہ بے حد اہم اور قابل احترام ہے اس شہر کو مسلمانوں نے صدیوں کی جدوجہد اور کوششوں کے بعد فتح کیا ہے۔ پہلی کوشش پاکؐ کے ایک چہیتے صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ شہید ہوئے تھے اس کے بعد مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کرنے کے لئے کئی جنگیں لڑیں لیکن ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا بالآخر ترکی سلطان محمد نے پوری تیاریوں اور منصوبوں کے ساتھ اس شہر پر حملہ کیا اور فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ یہ واقعہ ۱۴۵۳ء کا ہے اس وقت سے آج تک یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں ہے اور آج موجودہ ترکی کا پایہ تخت ہے جو استنبول کے نام سے مشہور ہے ترکی حکمرانوں نے ۵۰۰ سال تک اسلام کی حفاظت اور عظمت کے لیے یورپ سے ٹکر لی ہے۔اسی لیے شہر قسطنطنیہ بھی دنیا کے مسلمانوں کی نظروں میں اہم اور متبرک ہے۔نظم کا پانچواں اور آخری بند مدینہ منورہ کے متعلق ہے۔ یہ شہر مسلمانوں کے نزدیک بے حد اہم اور قابلِ احترام ہے اس کا پرانا نام یثرب ہے۔رسول پاکؐ نے شہر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی اس وقت سے اس کا نام

مدینہ منورہ اور مدینۃ النبیؐ کے نام سے مشہور ہے۔

شہر مدینہ مسلمانوں کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ شہر مسلمانوں کی نظروں میں قابل احترام اور مقدس بھی ہے اس کی خاک پاک میں دنیا کے نبیؐ آرام فرما رہے ہیں۔ اس شہر کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں اس کے دیدار کی آرزو رکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے اس شہر کی اہمیت وعظمت سمجھانے کے لیے بڑی اچھی مثال دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح کسی انگوٹھی میں نگینہ اہم ہوتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی نظروں میں یہ شہر اہم ہے اسی شہر سے دنیا دنیا میں مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ہوا ہے اے شہر مدینہ تو نے اپنی خاک میں اس ہستی کو پناہ دی ہے جس نے فقیری میں شہنشاہی کی ہے جس کے ادنیٰ غلام ایران وروم کے فاتح ثابت ہوتے ہیں۔

نظم کے آخری بند میں شاعر نے ایک خاص اور اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے علامہ اقبالؔ کا کہنا ہے کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد وطن نہیں بلکہ مذہب ہے اس لئے دنیا کے تمام مسلمان ایک قوم اور ایک ملت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایران وترکستان، چین وجاپان ،عرب وہندوستان ان کا وطن نہیں۔ مسلمان تو صرف مدنی ہیں یہ شہر مسلمانوں کا روحانی مرکز ہے۔ دنیا کے تمام مسلمانوں کو اس شہر سے ایک خاص قسم کا روحانی تعلق ہے۔ ہر مسلمان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ہی صحیح مدینہ منورہ کا دیدار کرے۔

اس نظم کا آخری شعر بڑا اہم ہے۔ شاعر نے اس شہر میں شہر مدینہ کو مخاطب کر کے کہا ہے۔

اے مدینہ تو جب تک دنیا میں باقی رہے گا اس وقت تک مسلمان بھی باقی وزندہ رہیں گے جس طرح ہر رات کے بعد صبح نمودار ہوتی ہے اور صبح کے ساتھ شبنم بھی ضروری ہے اور جس طرح صبح وشبنم کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ملت اسلامیہ کو مدینہ منورہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقدس شہر کا فیض کبھی بند نہیں ہوسکتا۔ رہتی دنیا تک اس کا فیض جاری رہے گا۔

4.7 : معلومات کی جانچ

۱) ڈاکٹر علامہ کی نظم ''بلاد اسلامیہ'' کا خلاصہ لکھئے۔

۲) مندرجہ ذیل اشعار سے کسی دو شہر کے بارے میں معلومات لکھئے۔

دہلی، بغداد ، قسطنطنیہ، قرطبہ

4.8 : نمونے کے امتحانی سوالات

۱) نظم ''بلاد اسلامیہ'' کا مرکزی خیال اپنے الفاظ میں پیش کیجئے۔

۲)　شہر مدینہ منورہ کے متعلق اقبالؔ کے خیالات بیان کیجئے۔

4.9 : فرہنگ

بلاد	---	بلد کی جمع (بلد بمعنی شہر)
مسجودِ دلِ غم	---	غمگین دل (دلیؔ کو) سجدہ کرتا ہے۔
اسلاف کا لہو خوابیدہ ہے	---	ہمارے آباواجداد کا لہو اس کے ذرّے ذرّے میں ملا ہوا ہے
حاصل	---	کھلیان، پیداوار
جہان آباد	---	مراد دلی
کرامات	---	بزرگی یا عظمت
ہمدوشِ ارم	---	ارم وہ حسین شہر ہے شداد نے بسایا تھا اور جس میں اس نے جنت ارضی بنائی تھی۔
بزم ملت بیضا	---	مراد مسلمان قوم لغوی معنی سفید یا روشن قوم کی محفل
دیا	---	ہندی میں چراغ کو کہتے ہیں
فروزاں	---	روشن
تاک	----	انگور کی بیل
دیار	----	شہر
سطوت	----	شان شوکت
آشانِ منہ آرائے شہِ لولاک	----	شہ لولاک یہ آنحضرت ﷺ کا لقب ہے۔
نکہت	----	خوشبو
خاتم ہستی	----	کائنات
تاباں	---	چمکدار یثرب مدینہ منورہ کا اصلی نام ہے
ماویٰ	---	جائے پناہ

☆☆☆

والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانی تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے ، شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پارفتار پر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں
نغمہ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیر عالمگیری میں ہر شے اسیر!
آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں
خشک ہوجاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں
قلب انسانی میں رقصِ عیش وغم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطف زیر و بم رہتا نہیں
علم وحکمت رہزن سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دِل آگاہ ہے !
گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز
میرے لب پر قصہ نیرنگی دوراں نہیں
دل میرا حیران نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں
پر تری تصویر قاصد گریہ پیہم کی ہے
آہ ! یہ تردید میری حکمت محکم کی ہے
گریہ سرشار سے بنیادِ جان پابندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقل سنگدل شرمندہ ہے
موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن مرا
حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا

رُخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پابپا اس نے کیا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے
علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں
کون میرا نہ خط آنے سے رہے گا بے قرار؟
خاک مرقد پر تری لیکر یہ فریاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
وہ جواں، قامت میں ہے جو صورتِ سرو بلند
تیری خدمت سے ہوا مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا

تجھ کو مثلِ طفلک بے دست وپا روتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و ساروتا ہے وہ
تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی
آہ ! دنیا ، یہ ماتم خانہ برنا و پیرا !
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر !
کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آسان ہی موت!
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں،قحط ہیں۔ آلام ہیں!
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں!
کلبہ افلاس میں ، دولت کے کاشانے میں موت !
دشت ودر میں،شہر میں،گلشن میں،ویرانے میں موت!
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اک طوقِ گلو افشار ہے!
قافلے میں غیر فریاد درا کچھ بھی نہیں
اک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں!
ختم ہوجائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی !
ہیں بس نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی !
سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ وگل ہیں تو کیا ؟
نالہ وفریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا ؟
جھاڑیاں، جن کے قفس میں ہے آہِ خزاں
سبز کردے گی انہیں یادِ بہار جاوداں
خفتہ خاکِ پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا ؟
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا ؟

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں !
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو ، یہ وہ گو ہر نہیں!
زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں !
آہ ! غافل ! موت کا راز نہاں کچھ اور ہے !
نقش کی نا پائداری سے عیاں کچھ اور ہے!
جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ!
کتنی بیدردی سے نقش اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
اس روش کا کیا اثر ہے ہیئت تعمیر پر ؟
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر ؟
فطرت ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خود تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو
آہ ! سیمابِ پریشاں، انجم گردوں فروز
شوخ پہ چنگاریاں ، ممنون شب ہے جن کا سوز
عقل جس سے سربزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگذشتِ نوع انساں ایک ساعت ان کی ہے
پھر یہ انساں آن سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر

جو مثالِ شمع روشن محفل قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کے وسعت فطرت میں
جس کی نادانی صداقت کے لیے بیتاب ہے
جس کا ناخن ساز ہستی کے لیے مضراب ہے
شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا ؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا ؟
تخم گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشوونما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خودنمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے
سردی مرقد سے بھی افسردہ ہوسکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بنکر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے لحد اس قوت آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا پیغام ہے!
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں !
موت اس گلشن میں جزسنجیدنِ پر کچھ نہیں !
کہتے ہیں اہل جہاں دردِاجل ہے لادوا
زخم فرقت قوقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقہ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے
وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخم تیغ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

سر پر آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں
ربط ہوجاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے
خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے
آدمی تابِ شکیبائی سے گو محروم ہے
اس کی فطرت میں یہ اک احساس نا معلوم ہے
جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں
رختِ ہستی خاک، گم کی شعلہ افشانی سے ہے
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے
آہ ! ضبطِ فغاں غفلت کی خاموشی نہیں !
پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرور آزاد ہے
سیکڑوں نغموں سے بادِ صبحدم آباد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رودبار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار
یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح ؟
دامِ سیمین تخیل ہے مرا آفاق گیر
کرلیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر !
یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دُعاؤں سے فضا معمور ہے

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے !
ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخم عمل کے واسطے
نورِ فطرت ظلمت پیکر کا زندانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوبتر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا !
آسماں تیری لحد پر شبنم افسانی کرے!
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے !

4.11 : خلاصہ

علامہ اقبال کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے جو اپنی والدہ ماجدہ مرحومہ کی یاد میں لکھی ہے جس کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ اس میں انہوں نے الفِ فرزندی کی تصویر کھینچ دی ہے لیکن جذبات سے قطع نظر اس کی نظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے موت و حیات کے فلسفہ کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے اور عام فہم مثالوں سے اس خشک موضوع کو بہت دلکش بنا دیا ہے اس نظم میں تیرہ بند ہیں۔

8.12 : تشریح

پہلے بند میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کائنات میں ہر شئے تقدیر الٰہی کی پابند ہے۔ انسان جو تدبیریں اپنی بہتری کے لئے کرتا ہے وہ اسی وقت کامیاب ہوتی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ بھی چاہے اگر وہ نہ چاہے تو کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی۔ یعنی تدبیر تقدیر کے سامنے عاجز ہے۔ کائنات میں ہر شئے مجبور ہے آسمان، سورج، چاند اور ستارے حرکت کرنے پر مجبور ہیں غنچہ مجبور ہے کہ پھول بن کر مرجھا جائے اسی طرح سبزہ گل بھی اُگنے پر مجبور ہیں۔ بلبل کا نغمہ بلبل کی آواز یعنی ہر شئہ خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ تقدیر الٰہی کی پابند ہے

دوسرے بند میں یہ بتایا ہے کہ جب انسان کو علم ہو جاتا ہے کہ میں خدا کی مشیت کے سامنے مجبور ہوں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتا ہے

اوراس پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ سب مشیتِ ایزدی کے مطابق ہے۔ پھر حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان عیش اور غم دونوں سے بیگانہ ہوجاتا ہے نہ جینے کی کوشش نہ مرنے کا غم۔ زندگی تو رہ جاتی ہے لیکن لطفِ زندگی جاتا رہتا ہے یہ علم وحکمت یہ احساس کہ میں مشیت ایزدی کے سامنے مجبور ہوں انسان کو رونے دھونے اور نالہ وفریاد رکھنے سے باز رکھتا ہے بالفاظ دگر جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ اس کا دل پتھر کا ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دولت کے ملنے سے خوش نہیں ہوتا اور دولت کے چلے جانے سے رنجیدہ نہیں ہوتا۔ اگر چہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں یعنی میں اپنے تخم کو ضبط کر رہا ہوں۔ چونکہ میں انسانی مصائب کا راز جانتا ہوں کہ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے انسان کدا کی مشیت کے سامنے بالکل مجبور ہے اس لئے میں کسی مصیبت پر شکوہ نہیں کرتا۔ اس لئے میں کسی سے زمانہ کی شعبدہ بازی کا تذکرہ نہیں کرتا اس لئے اگر کوئی تکلیف یا مصیبت مجھ پر آتی ہے تو نہ میں حیران ہوتا ہوں نہ پریشان نہ خنداں نہ گریاں لیکن اے مادر مہربان! جب میں تیری تصویر دیکھتا ہوں تو دل پر قابو نہیں رہتا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں یعنی تری تصویر (تصویر سے میری رائے میں والدہ مرحومہ کا تصور مراد ہے) میرے اس عقیدہ کی تردید کردیتی ہے۔

تیسرے بند میں یہ بتایا ہے کہ والدہ مرحومہ کے تصور سے مجھے اپنا بچپن یاد آگیا۔ کسی کی یاد میں آنسو بہانے سے زندگی کی بنیاد مضبوط ہوجاتی ہے یعنی محبت کے سامنے عقل کی کوئی حقیقت نہیں ہے واضح ہو کہ اقبالؔ نے عقل کو سنگدل اس لئے کہا ہے کہ عقل ہمیں رونے سے باز رکھتی ہے۔

آہ فریاد سے انسان کا دل منور ہوجاتا ہے اس لئے میں ہر وقت روتا رہتا ہوں۔ آنسوؤں کے خزانے سے میرا دامن معمور ہے یعنی ہر وقت روتا رہتا ہوں۔

گنج بادآور خسروؔ پرویز کے آٹھ خزانوں میں سے ایک خزانہ کا نام تھا۔ جو فارسی ادب میں بہت مشور ہے اقبال نے شدت گریہ کے اظہار کے لئے گنج آب آور کی ترکیب واضح کر کے اُردو ادب کا دامن بہت وسیع کردیا۔

مادر مرحومہ سے عالم خیال میں خطاب کر کے کہتے ہیں کہ میں تیری تصویر (تیرے تصور) کے اعجاز پر حیران ہوں! اس میں ایسی قوت پائی جاتی ہے کہ اس نے زمانے کی رفتار کا رخ بدل دیا۔ یعنی آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف لوٹنے لگا۔ اقبالؔ نے ماضی کو حال کے ساتھ وابستہ کردیا۔ یعنی جوانی کے عالم میں ہوں لیکن بچپن کا دور میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ زمانہ جب میں تیری آغوش میں پرورش پارہا تھا اور اچھی طرح بول بھی نہیں پاسکتا تھا۔ اور اب وہی میں ہوں کہ ساری دنیا میں میری گفتگو (شاعری) کا شہرہ اور میرا کلام اہل نظر کی نگاہوں میں موتیوں سے بڑھ کر ہے۔

چوتھے بند میں یہ بتایا ہے کہ ماں کی نظروں میں اس کا جوان بیٹا بھی بچہ ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت شابنہ ہے کہ انسان خواہ تنا ہی عالم فاضل کیوں نہ اور وہ کتان ہی عمر رسیدہ کیوں نہ ہو دنیاوی اعتبار سے کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ جسمانی اعتبار سے کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو لیکن جب وہ اپنی ماں کے سامنے آتا ہے از تو وہی طفل نادان بن جاتا ہے جو کبھی تھا وہی ہنسی، وہی بے فکری۔

پانچواں بند: اب اقبالؔ اپنی مادر مشفقہ کی یاد میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اب کون میرا انتظار کرے گا؟ کون میکرا خط نہ ملنے سے بے قرار ہوا کرے گا؟ اب کون میرے لئے دُعا کیا کرے گا۔

اس کے بعد تصور میں اپنی ماں سے جس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے خطاب کرتے ہیں کہ اے مادر مہربان! یہ آپ ہی کی تربیت کا فیض ہے کہ میں ستاروں کا ہم نشین بن گیا آپ ہی میرے دل میں اسلام کی محبت کا چراغ روشن کیا۔ آپ ہی نے مجھے انبیاء اللہ سے محبت کرنا سکھایا۔ آپ ہی کی نگاہ سے میرے اندر قوم کا عشق پیدا ہوا جس کی بدولت میرے باپ دادا (خاندان) کا نام دنیا میں روشن ہو گیا۔ اے مادر مہرباں! دنیا میں آپ کی زندگی قابل قدر تھی اور میں نے آپ سے دینی اور دنیاوی دونوں قسموں کی نعمتیں حاصل کیں۔ افسوس یہ ہے کہ آپ نے ساری عمر میری خدمت کی لیکن جب میں آپ کی خدمت کے لائق ہوا تو آپ رخصت ہو گئیں۔ میرا بڑا بھائی جو میرا محسن بھی ہے اور رفیق بھی۔ اور مشیر بھی ہے اور غمگسار بھی آپ کی وفا پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔ ہم دونوں م یں پہلے بھی محبت تھی لیکن شرکت غم و محبت اور محکم ہو گئی۔

چھٹا بند: یہ دنیا کیا ہے؟ ایک ماتم خانہ ہے جس میں ہر شخص مصروف ماتم نظر اتا ہے خواہ جوان ہو یا بوڑھا، یہاں زندگی بسر کرنا تو دشوار ہے لیکن موت نہایت ارزاں ہے اور ہر جگہ مل سکتی ہے۔ ہوا کی طرح موت بھی ہر جگہ پائی جاتی ہے دنیا امراض کے علاوہ موت کی اور صورتیں بھی تو ہیں مثلاً زلزلے، بجلیاں، قحط، سیلاب اور جنگ وغیرہ۔ موت ہر جگہ ہے فقیر کے ''کلیہ احزاں'' سے لے کر بادشاہ کے عشر کدہ تک، ہر جگہ نہ کوئی موت سے بچ سکتا ہے اور نہ اسے ٹال سکتا ہے اور نہ کوئی شخص کسی سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ فلاں شخص کو بیٹھے بٹھائے موت کیوں آ گئی۔ غور سے دیکھو تو زندگی کیا ہے سراسر مصیبت ہے۔ یہ دنیا ایک پلیٹ فارم ہے جہاں سے ہر وقت ہر لمحہ موت کی گاڑی روانہ ہوتی رہتی ہے اور ہر شخص اپنے عزیزوں کی جدائی میں آنسو بہاتا رہتا ہے۔

ساتواں بند: ساتویں بند میکس یہ بتایا گیا ہے کہ موت انسانی زندگی کو نہیں فنا کر سکتی۔ آخر کار امتحان کا دور (موت کا سلسلہ) ختم ہو جائے گا۔ اس دنیاوی زندگی کے بعد دوسری زندگی ضرور نصیب ہو گی۔ اس دنیا میں ہر شخص غمگین ہے۔ لیکن موت کے بعد ہمیشہ کے لئے زندگی کے باغ میں از سر نو بہار آ جائے گی۔ اس مٹی کے جسم میں ہماری روح مقید ہے تو کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ زندگی (روح انسانی) کا انجام فنا یا نیستی نہیں ہے۔

آٹھواں بند : اس بند میں میں علامہ اقبالؔ زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں زندگی فطرت کی نظر میں اس قدر قیمتی ہے کہ اس نے ہر شئے کے اندر اس کی حفاظت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اگر موت زندگی کو فنا کر دینے پر قادر ہوتی تو فطرت موت کو اس قدر عام نہ کر دیتی۔ چونکہ موت عالمگیر ہے اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے جس طرح خواب سے زندگی میں خلل واقع نہیں ہوسکتا اسی طرح موت بھی زندگی کو ختم نہیں کرسکتی۔

اے مخاطب! تو موت سے ڈرتا ہے کیونکہ تو موت کی حقیقت سے واقف نہیں ہے نقش (انسان) کی ناپائیداری کا مطلب وہ نہیں جو تو سمجھتا ہے کہ موت انسان کو فنا کر دیتی ہے یہ غلط ہے صرف نقش فنا ہوتا ہے انسان بدستور باقی رہتا ہے۔ ہوا کو دیکھو وہ ہر وقت پانی کے بلبلوں کو توڑتی ہے لیکن وہ اس بے دردی سے اسی لئے توڑتی ہے کہ وہ ان کو دوبارہ پیدا کرسکتی ہے اسی طرح قدرت (خداوندی) اگر انسان کو موت دیتی ہے تو اسی لئے کہ وہ دوبارہ اسے پیدا کرسکتی ہے۔

نواں بند : روح انسانی فنا سے پاک ہے اقبالؔ اب بقائے روح کو دوسری مثال سے سمجھاتے ہیں ذرا آسمانوں کے ستاروں پر غور کرو جو رات کو حسن عطا کرتے ہیں انسان کی عقل حیران ہے وہ نہیں بتاسکتی کہ ستارے کب پیدا ہوئے تھے۔ حضرت انسان جو اس قدر بلند مقاصد رکھتا ہے جو مقاصد کی پاکیزگی میں فرشتوں سے بڑھ کر ہے جو محفل قدرت میں شمع کی حیثیت رکھتا ہے اگر وہ نہ ہو تو ساری کائنات میں اندھیرا ہو جائے جس کے تخیلات میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کے سامنے آسمان ایک نقطہ سے زیادہ نہیں ہے جو دنیا میں اللہ کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ستارے کے لئے جس کی نادانی صداقت کے لئے یعنی انسان ظالم ہے اور جاہل بھی اقبالؔ نے مندرجہ ذیل مصرعہ میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے۔

ع ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

یعنی انسان صداقت (توحید) کے لئے ساری دنیا سے قطع تعلق کرسکتا ہے تو کیا یہ انسان اپنی ذات کے لحاظ سے آسمان کے ستاروں سے بھی کمتر ہے؟

دسویں بند: موت وہ دروازہ ہے جس سے گذر کر ہم زندگی کی دوسری اور بلند منزل میں داخل ہوتے ہیں۔

اقبالؔ تیسری منزل سے سمجھاتے ہیں ذرا پھول کی زندگی پر غور کرو۔ آپ تخم گل کو کوزہ میں بوتے ہیں وہ مٹی میں چھپ جاتا ہے لیکن مٹی میں مل کر بھی ظہور کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ یعنی مٹی میں پوشیدہ ہو جانے سے اس کی زندگی کا شعلہ تو فنا نہیں ہوتا وہ بدستور ابھرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ تخم اپنی ''تربیت'' سے نکل کر پھول کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ گل کی لحد خود اس کی حیات ثانیہ کا انتظام کرتی ہے کتنا عجیب قانون قدرت ہے کہ کیا موت دراصل روح کے فنا کا نام نہیں ہے بلکہ

زندگی کی کیفت میں ایک خاص انقلاب کا نام ہے۔

گیارہویں بند: اس بند میں اقبالؔ نے یہ واضح کیا ہے کہ جوہر انسان عدم سے آشنا نہیں ہوتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ موت کا علاج ہے اور مرنے والوں کو جدائی کا صدمہ کچھ عرصہ کے بعد زائل ہوجاتا ہے۔لیکن جذباتی قسم کے انسان کا دل جس میں مرنے والوں کا غم آباد ہے۔صبح وشام یعنی زمانے کی قید سے آزاد ہے اس لئے وقت کا مرہم اس کے زخم کو شفا نہیں دے سکتا ان کے غم کو زائل نہیں ہوتا یعنی وقت جدائی کے زخم کو اچھا نہیں کرتا۔جب انسان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ رونے لگتا ہے اور رنج وغم اس کی عادت بن جاتی ہے اس کے دل کو نالہ وفریاد سے ایک مستقبل وابستگی ہوجاتی ہے۔اگرچہ انسان اس صدمہ کی تاب نہیں لاسکتا لیکن اس کے دل میں یہ احساس ضرور پوشیدہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوجاتا غم انسان کو زندہ درگور کردیتا ہے اور بسا اوقات وہ لطفِ ہستی سے محروم ہوجاتا ہے لیکن یہ احساس کہ میرا محبوب فنا نہیں ہوا ہے یہ احساس گویا وہ پانی ہے جس سے غم کی آگ ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔

بارہواں بند: بارہویں بند میں اقبالؔ ایک مثال اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غور کرو! جب صبح ہوتی ہے تو وہ تمام چیزیں جو رات کے وقت ''مردہ'' تھیں دوبارہ زندہ ہوجاتی ہیں۔لالہ افسردہ۔دوبارہ تر وتازہ ہوجاتا ہے پھول شگفتہ ہوجاتے ہیں چڑیاں چہچہانے لگتی ہیں۔بلبل گانے لگتی ہے۔قصہ مختصر فضاء طائروں کے نغموں سے گونج اٹھتی ہے ہر طرف زندگی کے آثار نمودار ہوجاتے ہیں۔باغوں میں پہاڑوں میں دریاؤں اور خشکی میں جتنے جاندار رات کو سوئے ہوئے تھے۔سب بیدار ہوجاتے ہیں یعنی دوبارہ زندگی حاصل کرتے ہیں۔پس اگر ہستی کا قانون یہ ہے کہ ہر شام کے بعد صبح ہے یعنی ہر موت کے بعد زندگی ہے تو انسان مرکر دوبارہ زندہ کیوں نہیں ہوگا۔

تیرہواں بند: آخری بند میں پھر اقبالؔ والدہ مرحومہ سے خطاب کرتے ہیں۔اے مادر مہربان! میرا تخیل اس قدر زبردست ہے کہ ساری دنیا اس کے قبضہ میں ہے اس کی بدولت میں نے تیری یاد کو بھی اپنے قبضہ میں کرلیا تھا۔جس طرح کعبہ کی فضاء دُعاؤں سے معمور ہے اس طرح میرے دل کی فضاء تیری یاد سے معمور ہے۔

زندگی ہر جلوہ گاہ میں مختلف طور طریقہ رکھتی ہے جسے ہم آخرت کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ نئی قسم کی زندگی کا دوسرا نام ہے یعنی مرنے کے بعد انسانی زندگی ایک نئی منزل میں داخل ہوتی ہے اور وہاں اس کی رسم وعدہ (طریق عمل) دنیا سے مختلف ہوگی۔

اگر انسان کے پاس وہاں اس دنیا کے اعمال صالحہ کا حاصل نہیں ہوگا یعنی اگر انسان نے اس دنیا میں اس دنیا کے لئے کوئی سرمایہ جمع نہیں کیا تو وہاں وہ انسان اجل کا لقمہ بن جائے گا اور جو لوگ یہاں سے عمل صالح کا سرمایہ اپنے ساتھ لے جائیں گے وہ

وہاں ہمیشہ کی زندگی حاصل کرلیں گے بالفاظ دیگر اگر اس دنیا میں عمل صالح کا تخم بودیا ہے تو اس دنیا میں اس کا پھل کھا سکتے ہیں۔

یادرکھو! تمہاری روح (نورِفطرت) ہمیشہ کے لئے جسم کی قید میں نہیں ہے وہ اس دنیا میں بے شک جسم سے وابستہ ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ اس جسم کی تاریکی میں مقید رہے گی انسانی قوت فکر مادیات سے بالاتر بھی ہوسکتی ہے یعنی عقل کا تقاضہ ہے کہ انسان اس عالم میں بھی ترقی کرے گا۔

اب اقبالؔ اپنی والدہ مرحومہ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں اے مادر مشفقہ! آپ کی زندگی نور اسلام اور ضیائے ایمان کی بدولت چاند سے بھی زیادہ روشن تھی اور آپ کی رحلت نجم السحر سے بھی زیادہ قابل ستائش بھی یعنی آپ کا انجام بھی بخیر ہوا۔ کیونکہ آپ کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔

خدا کرے آپ کی قبر ہمیشہ نور سے معمور اور منور رہے۔ اور آسمان سے آپ کی قبر پر ہمیشہ رحمت الٰہی کا نزول ہوتا رہے۔

4.13 : معلومات کی جانچ

۱۔ نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کا خلاصہ لکھئے۔

4.14 : نمونے کے امتحانی سوالات

۱)

۲)

4.15 : فرہنگ

زنجیر عالم گیر -- مراد۔ اللہ کا قانون (جس میں ہر شئہ مکڑی ہوئی ہے)

غنچہ کا سبو -- غنچہ

سیل رواں -- سیلاب۔ مایہ دار

اشکِ عنابی -- سرخ آنسوؤں سے لبریز

آلام -- الم کی جمع

نیرنگی دوراں -- وہ تبدیلیاں جو دنیا میں ہر وقت ہوتی رہتی ہیں

نیرنگ کے لغوی معنی ہیں۔ دھوکہ۔ فریب

گنج آب آورد -- آنسوؤں کی جھڑی

حیرتی -- حیران

پابپا -- قائم یا وابستہ

اوج -- بلندی

طفلِ سادہ -- بے وقوف یا بھولا بچہ

کھوئے فردوس -- مراد بچپن

بازو -- مددگار

مسا -- شام

کشت -- کھیت

کلب -- گھر یا مکان

خاک بے سپر -- وہ خاک جو ایک دِن فنا ہو جائے گی

ذوق لفظ زندگی -- زندگی کی حفاظت

حجت -- دلیل

سر بزانو -- حیران

آن سوئے افلاک -- لغوی معنی میں (افلاک کے اس طرف)

کم بہا -- کم قیمت

اپنا آفتاب -- روحِ انسانی

تجدید فراقِ زندگی -- زندگی کی کیفیت کو از سرِ نو پیدا کرنا

سرشگ آباد -- وہ جگہ جو آنسوؤں سے آباد ہو

جوہر انسان -- روح یا نفسِ ناطقہ

دلآسانی	--	راحت یا سکون یا تسکین
رودبار	--	دریا
سیمن تخیل	--	تخیل کا وہ جال جو چاندی کے تاروں سے بنایا گیا ہو مراد دلکش تخیل
خاکی شیستان	--	قبر
سبزۂ نورستہ	--	وہ سبزہ جو نیا (تازہ) اُگا ہوا ہو۔

4.16 : ایک آرزو

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب ! کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو!
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل ننھے سے دل میں اس کا کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو سرخی لیے سنہری پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل ، وہ صبح کی موذن میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں روزن ہی جھونپڑی کا مجکو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے رونا مرا وضو ہو ، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہردرد مندول کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

4.17 : خلاصہ

نظم ''ایک آرزو'' علامہ اقبال کی ایک بانگ درا کی بہترین نظموں میں سے ہے نظم میں اپنی سادگی، سلاست، تاثیر یعنی اثر آفرینی اور شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے درا کی بہترین نظموں میں سے ہے اقبال نے اس نظم میں شاعرانہ مصوری کا کمال دکھایا ہے اور اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ خیالات جس کا اظہار اقبال نے اس دل پذیر نظم میں کیا ہے کم وبیش ہر اس شخص کے دل میں موجزن ہوتے ہیں جو دنیا والوں کی حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے شاعر دنیا کی تمام محفلوں سے اکتا گیا ہے اس لئے انجمن میں بھی دل نہیں لگ رہا ہے کیوں کہ دل بجھ گیا ہے شاعر یہ بھی کہتا ہے کہ جن لوگوں کی قوت ارادی زبردست ہوتی ہے وہ ایک جھٹکے میں سارے تعلقات توڑ دیتے ہیں۔

دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر اپنی زندگی عزلت میں بسر کردیتے ہیں اور جو ترک دنیا کی منصوبہ بندی میں زندگی گذار دیتے ہیں اور جو اس نعمت (قوت ارادی) سے محروم ہوتے ہیں۔

شاعر پورے طور سے اس آرزو کو عملی جامہ پہنا سکے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی زندگی بڑی حد تک درویشی استغناء اور عزلت کی پیدا کر لی تھی اور ان کی زندگی میں سادگی تو اس درجہ نمایاں تھیں کہ انسان نے آج تک اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عزلت نشینی کی آرزو کے باوجود اقبال دوسروں کے لئے جینا چاہتے ہیں۔ یہی ایک مسلمان کی شان ہے کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے جیتا ہے اقبال ان لوگوں کو جو بے ہوش پڑے ہیں جگانا چاہتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان کی یہ آرزو پوری کردی آج جو کچھ مسلمانوں میں بیداری نظر آتی ہے سب اقبال کے پیغام ہی کا ثمرہ ہے۔

4.18 : تشریح

یہ نظم بانگِ درا کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اقبالؔ نے اس نظم میں شاعرانہ مصوری کا کمال دکھایا ہے ان محاسن معنوی کے علاوہ انہوں نے اس میں پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ خیالات جس کا اظہار اقبالؔ نے اس دل پذیر نظم میں کیا ہے کم وبیش ہر اس شخص کے دل میں موجزن ہوتے ہیں جو دنیا اور دنیا والوں کی حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ اب اس کے بعد عمل کی منزل آتی ہے تو جن لوگوں کی قوتِ اداری زبردست ہوتی ہے۔ اب اس کے بعد کی منزل آتی ہے جن لوگوں کو قوتِ ارادی زبردست ہوتی ہے وہ ایک جھٹکے میں سارے تعلقات توڑ کر رکھ دیتے ہیں اور دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر اپنی زندگی عزلت میں بسر کردیتے ہیں اور جو اس نعمت (قوت اِرادی) سے محروم ہوتے ہیں وہ رام الحروف کی طرح تک دنیا کی منصوبہ بندی ہی میں زندگی گذار دیتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی زندگی میں بڑی حد تک درویشی، استغناء اور عزلت کی شان پیدا کر لی تھی اور ان کی زندگی میں سادگی تو اس درجہ نمایاں تھی کہ راقم الحروف نے آج تک اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عزلت نشینی کی آرزو کے باوجود اقبالؔ دوسروں کے لئے جینا چاہتے ہیں۔ اور یہی ایک مسلمان کی شان ہے کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے جیتا ہے۔ اقبالؔ ان لوگوں کو جو بے ہوش پڑے ہیں جگانا چاہتے ہیں

اور مجھے خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان کی یہ آرزو پوری کردی۔ آج جو کچھ مسلمانوں میں بیداری نظر آتی ہے یہ سب اقبال کے پیغام ہی کا ثمرہ ہے۔

4.19 : معلومات کی جانچ

۱۔ شاعر دنیا کی محفلوں سے کیوں اُکتا گیا ہے؟

۲۔ شاع دامان کوہ میں کس چیز کی آرزو کرتا ہے؟

4.20 : نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ شاعر کا ٹوٹا ہوا دیا کس کی اُمید کا سہارا ہے۔

۲۔ شاعر اپنے وطن پر آنسو کیوں بہانا چاہتا ہے؟

۳۔ ''آرزو'' اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔

4.21 : فرہنگ

دل بجھ ہی گیا ہو	--	اس محاورہ سے مایوسی اور ناکامی کا اظہار ہوتا ہے۔ (یعنی وہ حالت جب دل میں کوئی آرزو باقی نہ رہے)
شورش	--	ہنگامہ
عزلت	--	تنہائی
جہاں نما	--	اشارہ ہے، جمشید کے ساغر کی طرف جس میں دنیا کا حال نظر آتا تھا
جلوت	--	خلوت کی ضد ہے (انجمن، محفل)
دیر وحرم	--	بتکدہ یا بتخانہ اور حرم بمعنی مسجد
دروازہ گھنٹہ	--	جو قافلے کی روانگی سے پہلے بجاتے ہیں۔
کوہ	--	پہاڑ
روزن	--	جھروکہ
سکوت	--	خاموشی
سرو	--	راگ، نغمہ
کہسار	--	پہاڑ
قبا	--	پوشاک
نالہ	--	فریاد

دلیل صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا ، گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا وفا رابی !
مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہن ہندی، نطق اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
'' نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی ''
تڑپ صحن چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
وہ چشمِ پاک ہیں کیوں زینتِ بزگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی !
ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کردے
سرشک چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا !
ربود آں ترک شیرازی دلِ تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا !
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم نوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا !
جہانبانی سے ہے دشوار ترکارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا !
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے

مسلماں سے حدیثِ سوز و سار زندگی کہہ دے
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے !
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے !
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے !
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی !
تبانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تو رانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہین قہستانی!
گمان آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی !
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا ؟ زورِ توحید، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ !
ہوئے اصرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی!
ثباتِ زندگی ایمان محکم سے ہے دنیامیں
کہ المانی سے بھی پابندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پر روح الا میں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیرین، نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا ؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں !
ولایت ، پادشاہی ، علم اشیاء کی جہانگیری،
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں !
براہیمی نظر پیدا مگر شکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں!
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ با ید مردرا طبعِ بلندئے مشربِ نابے
دل گرمئی نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے !
عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے !
ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو ، بن کر گہر نکلے !
غبارِ رہگذر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے !
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بیخبر نکلے !
حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے !

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر ، پابندہ تر، تابندہ تر نکلے !
جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے ، اُدھر نکلے ، اُدھر ڈوبے، ادھر نکلے !
یقیں افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہوجا
ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا ، محبت کی زباں ہوجا
یہ ہندی، وہ خراسانی ، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاودان ہوجا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تندرو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی
ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے !
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے !
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجہ خونین میں تیغِ کارزاری ہے !

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو کر گرہ غنچے کی وا کردے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیاء کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جو لانگہِ اطلس قبایان، تتاری ہے !
بیاپیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
'' پس ازمدت گذارافتاد برما کروانے را''
بیاساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد، نگار آمد، قرارآمد!
سرت گردم تو ہم قانون پشیں سازدہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد!
کنارا از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد !
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ مانمناک میگرود
بیا زارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد!
سرِ خاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہالِ بفیشا نیم و مے در ساغر انداز یم
فلک راسقف بشگا فیم و طرحِ دیگر اندازیم ''

4-:23 خلاصہ

''طلوع اسلام'' علامہ اقبالؔ کی ایک مشہور نظم ہے علامہ اقبالؔ اس نظم میں ہمارے سامنے ایک رجائی شاعر کے طور پر آتے ہیں وہ اپنی قوم کے لوگوں کو ایک نئے دور اور روشن مستقبل کی نوید دیتے ہیں اور بڑے رجائی انداز میں کہتے ہیں کہ راہ اگر چہ دشوار ہے لیکن منزل صاف نظر آ رہی ہے۔قوم اگر ہمت نہ ہارے اور حوصلہ کے ساتھ راہ پر گامزن رہی تو یقیناً وہ منزلِ مراد پر پہنچ کر رہے گی۔

علامہ اقبالؔ نے یہ نظم یونانیوں کے مقابلے میں ترکوں کی فتح سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔اقبالؔ کی نظر میں یہ فتح روشن مستقبل کی بشارت تھی اور انہیں پورا یقین تھا کہ مسلمانوں کی اقبال مندی کا سورج پھر طلوع ہونے والا ہے۔مصطفیٰ کمال پاشا کی شکل میں اقبالؔ کو ایک مسیحا نظر آیا۔جس نے دشمنان اسلام کو شکست دے کر مسلمانوں کا سر بلند کر دیا تھا۔

4.24 : تشریح

علامہ اقبالؔ نظم کی ابتدا ہی رجائی لب ولہجہ سے کرتے ہیں کہ طلوع آفتاب دور گراں خوابی کے خاتمے کا اشاریہ ہے خدا مسلمانوں کو شکوہ ترکمانی، ذہنِ ہندی اور نطق اعرابی کرنے والا ہے۔مسلمانوں کو ان بے پناہ صلاحیتوں سے نواز کر اللہ ان سے دنیا کی امامت کا کام لینے والا ہے اس لئے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر امامت عالم کے لئے اخوت، محبت، اتحاد، فقر وصدق زور بازوے حیدر اوعر پرواز شاہین جیسے اوصاف پیدا کریں۔کیونکہ جہاد زندگانی میں محکم یقین پیہم عمل اور عالمگیر جذبہ اخوت ومحبت کے بغیر کامیابی نہیں حاصل ہوسکتی۔علامہ اقبالؔ تمام دنیا کے مسلمانوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کو پیغام دیتے ہیں کہ اگر وہ خودشناسی، دلیری وشجاعت محبت واخوت جیسے اوصاف سے متصف ہوں اور رنگ ونسل کے امتیاز کو بھلا کر اتحاد واتفاق پیدا کر لیں تو وہ بھی لوگوں کی طرح آزاد ہو سکتے ہیں۔اقبالؔ اس پیغام پر اپنی نظم کا خاتمہ کرتے ہیں کہ دنیا پیغام سننے کے لئے گوش برآواز ہے لہذا مسلمانوں کو یہ پیغام دنیا والوں تک پہنچانا چاہیے۔پیغام اسلام ہی دنیا والوں کو خوشگوار انقلاب سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

یہ نظم اقبالؔ کی اہم نظم ہے۔پوری نظم پر امید اور مسرت کی فضا چھائی ہوئی ہے اس نظم کا نشاطیہ لہجہ پڑھنے والوں کو بھی شادمانی و مسرت سے سرشار کر دیتا ہے۔اس نظم میں شاعر نے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے مختلف پیرائے استعمال کیے ہیں۔کہیں استعاراتی زبان استعمال کی ہے کہیں خطیبانہ طرز بیان اختیار کیا ہے۔ان مواقع پر شاعر کا لہجہ کافی بلند ہو گیا ہے۔اس خطیبانہ لب ولہجہ

اور بلند آہنگی سے بلاشبہ شعریت متاثر ہوئی ہے لیکن مجموعی اعتبار سے یہ نظم اقبالؔ کے تخلیقی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بقول سلیم چشتی ''بندش اور ترکیب، مضمون آفرینی اور بلند پروازی، رمز و کنایہ کی فراوانی اور مشکل پسندی، شوکت الفاظ اور فلسفہ طرازی غرض کہ صوری اور معنوی محاسن شعری کے اعتبار سے یہ نظم بانگ درا کی تمام نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔''

4.25 : معلومات کی جانچ

۱۔ نظم ''طلوع اسلام'' کی خصوصیات پیش کیجئے۔

۲۔ اقبالؔ کی نظم گوئی کا جائزہ لیجئے۔

4.26 : نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کی نظم ''طلوع اسلام'' کا خلاصہ لکھئے۔

۲۔ بانگِ درا کی نظموں پر ناقدانہ اِظہار خیال کیجئے۔

4.27 : فرہنگ

تنگ بابی	---	کم کم چھکنا، گہری نیند کی کیفیت
عروق	---	عرق کی جمع، رگ
تقدیر سیمابی	---	سیماب کی خاصیت
جگر تابی	---	شجاع، جوش جہاد
ضمیر لالہ	---	مراد مسلمانوں کا دل
نیساں سے ابر نیساں مراد	---	وہ بادل جس کے نظر سے موتی پیدا ہوتی ہیں۔
نیساں	---	قدیم سریائی زبان میں وہ مہینہ جو اپریل سے مطابقت رکھتا ہے۔
تبریز	---	ایران کا مشہور شہر
جہاں بینی	---	نظام کائنات کو سمجھنا
خدائے لم یزل	---	وہ خدا جسے کبھی زوال نہیں ہوگا۔

آنی --- آن سے نکلا ہے

مکیں --- مراد، انسان

امین --- حاصل وممکنات زندگانی

ممکنات زندگانی --- انسانی ترقی کی تمام صورتیں

جوہر مضمر --- کائنات کے پوشیدہ اسرار

میانِ شاخساراں --- درختوں کی شاخوں میں

قہستان --- خراسان میں ایک خطہ یا ضلع

قندیل رہبانی --- وہ چراغ جو کسی راہب کی جھونپڑی میں جل رہا ہو۔

استبداد --- ظلم وستم

روح الامین --- حضرت جبرئیل کا لقب

ذوق یقین --- ایمان محکم (مراد)

(اقبالؔ نے اکثر یقین کو ایمان کے معنی میں استعمال کیا

حذر --- بچنا یا ڈرنا

چیرہ دست --- ظالم

مصاف --- میدان جنگ

حیریر و پرنیاں --- اعلیٰ قسم کا ریشم

ریزہ کاری --- مہین کام، نازک زیورات میں نگینے جڑنا

خروش آموز بلبل ہو --- انسانوں کو محبت کا سبق پڑھا۔

اطلس قبایان تتاری --- مراد ترکان عثمانی

مرغ زار --- بلبل

نگار --- شوق

خیمہ کشیدن --- چھا جانا، امنڈ آنا

آبشار --- جھرنا

سرت گردم --- میں تیرے قربان

قانون پیشیں --- پرانا دستور

خیل --- لشکر

ہزار --- بلبل

مشتاقاں --- عشاق

حدیث --- قصہ، داستان، بات

خواجہ بدر وحنین --- سرکارِ دوعالم ﷺ کا لقب ہے

تصرّف --- کسی شئہ پر قبضہ یا اقتدار حاصل کرنا
اصطلاحی معنی ہیں کسی نبی یا ولی کی روحانی طاقت جس
کی بدولت وہ بغیر آلات ووسائل کائنات پر حکومت کرتا ہے۔

شاخ خلل -- ملت اسلامیہ مراد ہے

کامل عیار -- کہرا

نہال -- پودا

سازگار -- موافق

دیگر انداختن -- انقلاب برپا کرنا

8.28 : تصویر درد

تصویر درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستان میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا ہے تیری محفل میں ؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستان میری

اڑالی قمریوں نے ، طوطیوں نے ، عندلیبوں نے

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری

ٹپک اے شمع ! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

الٰہی ! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا ؟

حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا

وہ گل ہوں میں ،خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

'' دریں حسرت سرا عمر یست افسونِ جرس دارم
زفیضِ دل طپیدن با خروشِ بے نفس دارم''

ریاض دہر میں نا آشنائے بزمِ عشرت ہوں

خوشی روتی ہے جس کو ، میں وہ محرومِ مسرت ہوں

مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی

میں حرفِ زیر لب، شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک ، لیکن کچھ نہیں کھلتا

سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا

سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں

خزینہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے

کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں، کس کی دولت ہوں؟

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

نہ صبا ہوں ، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں ، نہ پیمانہ

میں اس میخانہ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینہ دل ہے قضا کے راز دانوں میں
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا افسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں!
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنا دل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں ! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہورہا ہے ، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک ؟ لذتِ فریاد پیدا کر !
زمین پر تو ہو ، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں!
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو !
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوب فطرت ہے

ہو یدا آج اپنے زخم پنہاں کرکے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کرکے چھوڑوں گا

مگرغنچوں کی صورت ہو دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کرکے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جومشکل ہےتو اس مشکل کوآساں کرکے چھوڑوں گا

مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کرکے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کرکے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں ، چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گذاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے

رہا دل بستہ محفل ، مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

تعصب چھوڑ ناداں ! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے

سراپا نالۂ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا !

سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے

صفائے دل کو کیا آرائش رنگِ تعلق سے

کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں ! حنا تو نے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے

غضب ہے سطر قرآں کو چلیپا کردیا تو نے !

زباں سے گر گیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل !

بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا

ارے غافل ! جو مطلق تھا مقید کردیا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ جوانی کی

دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشم پرنم کو

جو تڑپاتا ہے پروانے کو ، رلواتا ہے شبنم کو

نرا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اس کا

بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو

اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا

نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا

یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

نہ اُٹھا جذبہ خورشید سے اک برگ گل تک بھی

یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو

پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں

یہ زخمی آپ کرلیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور پر ہوتا ہے

دوا ہر دکھ کی ہے مجروع تیغِ آرزو رہنا
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

شراب بیخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

تھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثلِ حباب آبجو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو ! رہنا

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجکو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیاباں محبت دشتِ غریب بھی، وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے ،صحرا بھی
جرس بھی ، کارواں بھی، راہبر بھی ، راہزن بھی

مرض کہتے ہیں سب اس کو ، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاجِ گردش چرخِ کہن بھی ہے

وہی اک حسن ہے ، لیکن نظر آتا ہے ہر شئے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا ، بستیوں بھی ، کوہکن بھی
اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے ؟
سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے، ورنہ
چمن میں آہ ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھا ہے ساغر کو
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

8.29 : خلاصہ

یہ دلکش نظم اقبالؔ نے ۱۹۰۴ء کے آغاز میں لکھی تھی جب ان کی عمر ۳۰ رسال کے قریب تھی یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں جوانی کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبالؔ پر وطن دوستی کا رنگ غالب تھا۔

اس نظم میں اقبالؔ ایک وطن پرور (نیشنلسٹ) کی شکل میں قوم کے سامنے آتے ہیں اور جو رنگ ہمالہ، نیا شوالہ اور ترانہ ہندی میں پایا جاتا ہے وہی رنگ پوری شدت کے ساتھ اس نظم میں نظر آتا ہے انہوں نے دل کھول کر اہل وطن کی نفاق انگیز روش پر نوحہ خوانی کی ہے اور انہیں صاف لفظوں میں متنبہ کیا ہے کہ اگر تم نے آنے والی مصیبت کا اندازہ کر کے آپس میں اتحاد نہ کیا تو مٹ جاؤ گے اور

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بدقسمت وطن کی حالت زار انہیں اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ وہ ہر وقت اس کے تاریخ مستقبل پر آنسو بہانا چاہتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظم میں ایک سچے محبّ وطن کی مضطر روح آہ و فریاد میں مصروف نظر آتی ہے اور جو اشعار اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے میں وہ ہر محبّ وطن کو متاثر کر دینے کے لئے کافی ہیں جس بند کا پہلا شعر یہ ہے۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

یہ پورا بند اقبالؔ کے وطن پرورانہ جذبات کا بہترین مرقع ہے۔ اس نظم میں آٹھ بند ہیں ہم ہر بند کا مطلب جداگانہ لکھیں گے۔

4:30 : تشریح

پہلا بند : اس بند میں تمہید کا رنگ ہے کہتے ہیں کہ میری داستان اس قدر دردناک ہے کہ بہت کم لوگ اس کے سننے کی تاب لا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے خموشی کو اپنا شیوہ بنالیا ہے قوم کے افراد اس قدر بے حس ہو گئے ہیں کہ وہ میری فریاد سننا نہیں چاہتے یہی وجہ ہے کہ میری زبان بات کرنے کو ترستی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی سننے والا نہیں ہے۔ لالہ کے باغ جگر سے نرگس کی اشک فشاں آنکھوں سے اور گل کی سینہ کی چاک سے میرے سوز دروں اور بیتابی، دل کا کچھ انداز ہوسکتا ہے اور قمریوں، طوطیوں اور بلبلوں کے نغموں میں یہ سوز و گداز میری ہی طرز فغاں کی تقلید سے پیدا ہوا ہے میری داستان اس قدر دردانگیز ہے کہ اگر شمع کو سناؤ تو وہ بھیرونے لگے۔

اے خدا! اندریں حالات اس دنیا میں جینے کا کیا فائدہ ہے نہ زندگی میرے اختیار میں ہے نہ موت۔ اگر زندگی اختیار میں ہوتی تو میں ہمیشگی کی صفت پیدا کر لیتا اور اگر موت اختیار میں ہوتی تو ابھی مرجاتا کیونکہ اب جینے میں کوئی لطف باقی نہیں ہے۔ میری گریہ وزاری اور میری بربادی دراصل ساری کائنات کی بربادی ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے جب وہ فنا ہو گیا تو سمجھ ساری کائنات فنا ہوگئی۔

دری حسرت سرا عمر لسیت افسونِ جرس دارم
زفیض دل تپیدن با خروش بے نفس دارم

اقبالؔ نے اس شعر کو ایک باکمال آرٹسٹ کی طرح پہلے بند کا آخری شعر بنایا ہے کیونکہ اس شعر میں اس بند کی روح سمٹ کر آ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی کاریگر نے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہو۔

مطلب اس کا یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک مدت دراز سے میری کیفیت وہی ہے جو جرس کی ہے یعنی وہ بظاہر خاموشی ہے لیکن اس کے اندر شور پوشیدہ ہے۔ اسی طرح میں بظاہر خاموش ہوں۔ لیکن بقول غالبؔ۔

پر یوں میں نغموں سے یوں راگ سے جیسے باجہ
ایک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ عشق سے تپش دل پیدا ہوئی اور اس تپش دل کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری شخصیت خروش بے نفسی کا خزانہ بن گئی یعنی میرے سینے میں آہ و فریاد کا ایک طوفان پوشیدہ ہے لیکن بظاہر میں خاموش ہوں۔

دوسرا بند: دوسرے بند میں شخصی رنگ پایا جاتا ہے اس میں شاعر نے اپنی شخصیت اور اپنے مقام کو واضح کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ مجھے دنیا کی خوشیوں سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ خوشی بھی میری محرومی پہ روتی ہے اسی طرح گویائی بھی میری بدنصیبی پر

ماتم کرتی ہے کہ کوئی شخص میری داسان غم سننے کو تیار نہیں ہے۔ میں بہت پریشان ہوں لیکن اس عقیدہ کو حل نہیں کرسکتا کہ میں کون ہوں؟ سکندر (فاتح کائنات یا سردار عالم) ہوں یا آئینہ (کسی دوسری ہستی کا خادم ہوں) گرد کدور (محض بیکار شئے) ہوں؟ یہ سب کچھ ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں محور موجودات اور مرکز کائنات ہوں میری ہستی قدرت کا مقصد ہے اگر میں نہ ہوں تو یہ ساری بیکاری ہوجائے گی یہ سب کچھ میرے ہی لئے پیدا کیا گیا ہے بظاہر ظلمت (مشت خاک) ہوں۔لیکن میری حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے کہ سب کچھ اندر ہی موجود ہے وہ پھر باہر کی اشیاء کو یکھنے سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولادیت ہوں۔ یہ مصرعہ اس قدر بلیغ ہے کہ شرح سے بالاتر ہے اگر انسان اپنے دل کی سیر کرے تو اسے اس کے اندر ساری کائنات کا جلوہ نظر آئے گا اس لئے وہ اس خارجی دنیا کی سیر سے بے نیاز ہوجائے گا اگر اس کائنات کو میخانہ فرض کیا جائے تو انسان نہ تو شراب ہے نہ ساقی ہے نہ مستی ہے نہ پیمانہ ہے بلکہ اس میخانہ میں جس قدر اشیاء نظر آتی ہے انسان ان سب اشیاء کی حقیقت ہے۔یعنی سب کچھ اسی کی بدولت ظہور میں آیا ہے اگر وہ نہ ہوتو پھر کسی شئے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کوئی مصرف نہیں ہے کوئی مقصد نہیں ہے میں اپنے دل کے آئینہ میں ساری کائنات کا راز دیکھ سکتا ہوں یعنی انسان کا دل وہ آئینہ ہے جس میں ساری کائنات منعکس ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں جو دیکھتا ہوں وہی بے کم وکاست بیان کرتا ہوں۔

نوٹ:۔اس بند کے چار اشعار میں اقبالؔ نے تصوف کے حقائق ومعارف بیان کئے ہیں اور اگر کوئی شخص ان اشعار کو ذرا غور سے پڑھے۔

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد رہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

سے کر، میں اس میخانہ ہستی میں ہر شئے کی حقیقت ہوں، غور سے پڑھے گا اسے اقبالؔ کے فلسفہ خودی کے ابتدائی نقوش بھی نظر آسکتے ہیں۔افسوس ہے کہ میں اس مختصر شرح میں ان باتوں کی تفصیل بیان نہیں کرسکتا بس اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ شعر۔۔۔

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس میخانہ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

مرشد رومی کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

قالب آزماہست شد نے ماازد
بادہ آزماہست شد نے ماآرد

تیسرا بند : اس بند میں اقبالؔ نے اہل وطن کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اگر عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر رہے تو مصائب کا نزول یقینی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ خدا نے مجھ کو شعراء کی صف میں وہ مقام بلند کیا ہے کہ میں فرشتوں کا ہم زباں ہوں اور میرا دل قضاء وقدر کے اسرار کا آئینہ بن گیا ہے اس کے بعد ہندوستان سے خطاب کرتے ہیں کہ تیرے باشندوں کا طرز عمل مصلحت وقت کے اس قدر خلاف ہے کہ میں آئندہ مصائب کا تصور کر کے لرزہ اندام ہو جاتا ہوں اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اگر باغبان (ہندو مسلم) اسی طرح آپس میں لڑتے رہے تو گلچیں (انگریز) اس باغ کو ضرور تاراج کر دے گا۔ اس کے بعد اہل وطن سے خطاب کرتے ہیں کہ دشمن تمہیں برباد کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے اس لئے عہد کہن کی داستانوں کو چھوڑ کر مستقبل کی فکر کرو۔ عہد کہن کی داستانوں سے مسلمان بادشاہوں سے فرضی مظالم کی وہ داستانیں مراد ہیں جو ہندو مورخین نے دیدۂ دانستہ اپنی تصانیف میں درج کی ہیں تا کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوں۔

اے اہل وطن ان لوگوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو۔ جو ہندوستان کی مختلف اقوام میں منافرت پیدا کر رہے ہیں اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یقیناً مٹ جاؤ گے کیونکہ آئین قدرت یہی ہے کہ خدا اس شخص کی مدد کرتا ہے جو امن وامان قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔

چوتھا بند: اس بند میں اقبالؔ نے یہ بات بیان کی ہے کہ کوئی سنے یا نہ سنے میں اپنی ہی کوشش ضرور کروں گا میں اپنا درد دل اہل وطن کو ضرور سناؤں گا میں اس ملک سے نفرت اور عداوت کی ظلمت کو ضرور دور کروں گا اور اپنی ساری قوتوں کو اہل وطن کے لئے بیدار کرنے میں صرف کرونگا بیشک منتشر افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن میں کوشش کروں گا یہ مشکل کام آسان ہو جائے اور اقوام ہند میں اتحاد پیدا ہو جائے میں سب کو وطن کی محبت کا سبق پڑھاؤں گا اور جو حقیقت مجھ پر منکشف ہوگئی ہے کہ اتحاد ہی سے ہم کامیاب ہو سکتے ہیں اس کو سب لوگوں پر ظاہر کروں گا۔

پانچواں بند: اس بند میں اقبال نے اقوام ہند کو یہ تلقین کی ہے کہ اپنے زاویہ نگاہ میں وسعت اور خیالات میں بلندی پیدا کریں اور تعصب کو اپنے دل سے بالکل نکال دیں۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! مجھے افسوس ہے کہ تو نے اپنے خیالات میں رفعت پیدا نہیں کی۔ ساری عمر پست خیالات میں بسر کر دی تو نے اپنی جماعت کے تنگ حلقہ میں زندگی بسر کی دیگر ممالک اور دیگر اقوام نے طرز عمل کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ تو نے کبھی اپنی حقیقت پر غور کیا کہ خدا نے تجھ کو بلند مقاصد کے حصول کے لئے پیدا کیا ہے اگر تو دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے تو تعصب کو اپنے دل سے نکال دے تو جن لوگوں کو برا سمجھتا ہے وہ لوگ دراصل تیرے بھائی ہیں تو دنیاوی تعلقات کی روشنی میں مشغول ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس طریقہ سے تجھے صفائی قلب حاصل ہو جائے گی یہ تیری غلط فہمی ہے تیرا یہ

فعل ایسا ہی بے سود ہے جیسے کوئی شخص آئینہ پر مہندی لگا کر اسے رنگین کرنے کی کوشش کرے تو نے قرآنی تعلیمات سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ اس کی غلط تعبیر کی اور اس طرح حقیقت سے دور ہو گیا میرا یہ طرز عمل تیری کج بینی اور غلط فہمی کی دلیل ہے جس پر زمین اور آسمان دونوں ماتم کر رہے ہیں تو زبان سے توحید کا دعویٰ کر رہا ہے لیکن تو قرآن کے بجائے اپنے نفس کی اطاعت کر رہا ہے اس لئے اس زبانی دعویٰ سے تجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا تو صرف اپنی جماعت سے محبت کرتا ہے یعنی تو نے محبت کو جو ایک عالمگیر (مطلق) حقیقت ہے اسے صرف اپنی قوم کے افراد میں مقید کر دیا ہے تو ممبر پر بیٹھ کر اگر وعظ و نصیحت کرتا ہے تو اس میں اپنی قوم کو ساری دنیا سے محبت کرنے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ نصیحت میں بھی تیری افسانہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

چھٹا بند: اس بند میں اقبالؔ نے پانچویں بند کے خیالات کی مزید وضاحت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اپنی نگاہ کے اندر وسعت پیدا کر۔ وہ کسی خاص شمع سے محبت نہیں کرتا بلکہ روشنی سے محبت کرتا ہے خواہ روشنی دیر میں ہو یا حرم میں اسی خیال کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

یعنی تو اپنی آنکھ میں ایسی صلاحیت پیدا کر کہ وہ ہر شے میں خدا کا جلوہ دیکھ سکے اگر ایک انسان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ کافر بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے تو وہ اس پر مہربانی کرے گا جس طرح پروانہ ہر شمع سے محبت کرتا ہے اسی طرح شبنم ہر پھول کو (خواہ وہ ہندو کے باغ میں ہو یا مسلمان کے) فیض پہونچاتی ہے۔

اے مخاطب! اللہ نے انسان کو آنکھیں صرف مختلف اشیاء کو دیکھنے کے لئے نہیں دی ہیں بلکہ مقصد باری تعالیٰ یہ ہے کہ انسان ان کے ذریعے سے ہر شئے میں خدا کا جلوہ دیکھے اگر کوئی شخص اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے یعنی اپنے آپ کو نہ دیکھ سکے اور اس نے ساری کائنات کو دیکھ لیا تو بھی کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا۔ جس طرح جمشید نے اپنی ساری توجہ جام پر مبذول کی لیکن اس کے ذریعے وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہوسکا۔ یاد رکھو فرقہ بندی وہ ناپاک درخت ہے جس کا پھل تعصب ہے یعنی فرقہ بندی سے انسان کے اندر تعصب کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور تعصب جس شخص میں پیدا ہو جائے وہ اس دنیا میں کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا اسی پر قوم کو قیاس کر سکتے ہیں۔

جب تک ہمارے دل میں بلندی کی آرزو پیدا نہ ہوگی تم بلندی حاصل نہ کر سکو گے چنانچہ دیکھ لو برگِ گل میں رفعت کی تمنا نہیں ہے اس لئے وہ آفتاب کی طاقت جذب سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا اس کے مقابلہ میں شبنم اوپر جانا چاہتی ہے اس لئے جذب آفتاب سے فائدہ حاصل کر لیتی ہے اور اوپر چلی جاتی ہے جو لوگ شیوہ محبت اختیار کر لیتے ہیں وہ اس راہ میں دکھ بھی اٹھاتے ہیں

لیکن وہ کسی سے اپنے دکھ کا مداوا (علاج) طلب نہیں کرتے۔ کیونکہ محبت اگر زخم لگاتی ہے تو مرہم بھی خود مہیا کر دیتی ہے یعنی اگر اہل محبت کو دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کے سلسلہ میں کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو یہ احساس کہ ہم نے دوسروں کو فائدہ پہونچایا ان کی تکالیف کا مداوا (ازالہ) کر دیتا ہے۔ محبت میں یہ خاصیت ہے کہ دل میں خدا کا نور پیدا ہو جاتا ہے۔ بظاہر محبت بہت معمولی چیز ہے لیکن اس کی بدولت انسان خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔

ساتواں بند: اس بند میں اقبالؔ نے اس بات کی تلقین کی ہے کہ دوسروں کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرو لیکن کسی سے معاوضہ یا صلہ کی تمنا مت کرو۔ محبت کرو لیکن اس کا اجر صرف اللہ سے طلب کرو اگر تم دوسروں سے محبت کرو گے تو تمہاری تمام تکالیف دور ہو جائیں گے اگر اس سلسلہ میں کوئی تکلیف پہنونچے تو دوسروں سے شکایت مت کرو۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے اپنی ہستی کو جماعت کی ہستی میں فنا کر دیا۔ یعنی شراب بیخودی پی لی تو میری پرواز فلک تک ہوگئی یعنی میرا مرتبہ بہت بلند ہوگیا میں نے اپنے آپ کو قوم، ذات، قبیلہ اور خاندان کے رنگ سے پاک کرلیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص کے دل میں میری عزت قائم ہوگئی۔ یو بو سے مراد خوشبو ہے اور خوشبو کا کوئی رنگ نہیں ہوتا اس کے باوجود ہر پھول میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ میں ہر وقت وطن کی مصیبتوں پر روتا رہتا ہوں۔ آنسوؤں کو وضو کے پانی سے تعبیر کیا ہے اور عبادت کی رعایت سے وضو کا لفظ لائے ہیں ان خوبیوں کی وجہ سے مصرعہ میں بہت دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ چونکہ فرقہ بندی کی بناء پر ملک میں باعزت زندگی دشوار ہوگئی ہے اس لئے اس ملک میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ چمن سے وطن مراد ہے۔

اے مخاطب! اگر تو غور سے دیکھے تو صرف باہمی محبت و طاقت ہے جس کی بدولت قوم کو آزادی نصیب ہوسکتی ہے یعنی محبت انسان کو آزاد کر دیتی ہے اور جو قوم آپس میں برسرِ پیکار رہتی ہے وہ ہمیشہ غلامی مبتلا رہتی ہے افرادِ قوم کو لازم ہے کہ اپنے اندر بے نیازی کی شان پیدا کریں۔ بلبلہ سے سبق لو کہ وہ چونکہ شانِ بے نیازی رکھتا ہے اس لئے دریا میں رہ کر بھی محتاج آب نہیں ہوتا۔

اے مخاطب! اگر تجھے دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی آرزو ہے تو اپنی قوم سے بے پروائی اختیار مت کر بلکہ سب سے محبت کر۔ نوع انسان کی محبت ایسی شراب ہے کہ آدمی ساغر اور صراحی کے بغیر ہی مست رہتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جن قوموں نے دنیا میں ترقی کی ہے ان کے افراد کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔

آٹھواں بند : اس بند میں اقبالؔ نے محبت کی حقیقت اور اس کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت مجموعہ اضداد ہے اس کے رموز و نکات فہم انسانی سے بالا رہیں۔ اگر کوئی شخص قوم کی محبت میں ترک وطن کر دیتا ہے تو پردیس میں بھی اس کو وطن کا لطف حاصل

ہوسکتا ہے اور قفس میں رہ کر بھی اس کو چمن کی زندگی نصیب ہوسکتی ہے جو لوگ اپنے وطن کے سلسلہ میں قید و بند کی سختیاں گوارا کرتے ہیں انہیں وہ تمام تکالیف راحت معلوم ہوتی ہیں۔

عام طور سے لوگ محبت کو مرض قرار دیتے ہیں لیکن یہ مرض ایسا ہے کہ قوم کے تمام امراض کا مداوا کر دیتا ہے اس کی بدولت گردش چرخ کہن یعنی تمام مصیبتوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اگر کوئی شخص محبت کی آگ میں اپنے دل کو جلائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا دل سراپا نور ہو جائے گا جس شخص کا دل محبت کی آگ میں جل جاتا ہے تو وہ شمع انجمن بن جاتا ہے یعنی ایک دنیا پروانوں کی طرح اس پر نثار ہونے کو تیار ہو جاتی ہے۔

اے مخاطب! یہ ساری کائنات مظہر خدا ہے ہر شئے میں اسی کا حسن نظر آتا ہے۔ شریں بھی اسی کا جلوہ ہے اور فرہاد بھی اسی کا۔ یاد رکھو! جن قوموں کے افراد نے آپس میں نفرت کا بازار گرم کیا ہے وہ صفحہ ہستی سے نابود ہوگئی ہیں۔ کاش میرے اہل وطن اس نکتہ سے سبق حاصل کریں یہ داستان بہت طویل ہے اس لئے میں سکوت اختیار کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ورنہ اگر چاہوں تو اس موضوع پر بہت کچھ لکھ سکتا ہوں اس نظم کو اقبالؔ نے نظیری کے اس شعر پر ختم کیا ہے۔

نمی گردید کوتہ تشنہ معنی رہا کردم

حکامیت بودے پایاں بخاموشی ادا کردم

یعنی میری داستان درد چونکہ بہت طویل تھی اس قدر طویل کہ اس کی کوئی انتہا ہی نظر نہیں آتی اس لئے میں نے خاموشی اختیار کرنی مناسب سمجھی۔

8.31 : معلومات کی جانچ

۱۔ خیالی نظم گوئی میں 'تصویر درد' کا مقام و مرتبہ واضح کیجئے۔

۲۔ نظم 'تصویر درد' کا خلاصہ بیان کیجئے۔

8.32 : نمونے کے امتحانی سوالات

☆ ''نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے ہندوستان والو'' اقبال کے خیالات کا اظہار کیجئے۔

☆ نظم ''تصویر درد'' سے اقبالؔ نے ہم وطنوں کو کیا پیغام دیا ہے۔

4.33 : فرہنگ

نہیں منتِ کش باب	---	میری داستان اس قدر دردانگیز ہے کہ کوئی شخص اس کے سننے کی تاب نہیں لاسکتا
دستورزبان بندی	---	محفل میں بات کرنے کا حکم نہیں ہے۔
ورق	---	داستان کی رعایت کتاب کے اوراق پھول کی رعایت یعنی پھول کی پتیاں
ریاض	---	باغ میں حرف زیرلب شرمندہ
صہبا	---	شراب
میخانہ ہستی	---	کائنات
ہر شئے کی حقیقت ہوں	---	کائنات کی ہر شئے میرے وجود سے قسمت پاتی ہے
کلک ازل	---	کلک بمعنی قلم۔کلک ازل سے تقدیر الٰہی یا مشیتِ ایزدی
اسلوب	---	طور۔طریقہ یا طرز
ہویدا	---	ظاہر
لہورونا	---	شدت کے ساتھ رونا
سوز پنہاں سے مراد	---	عشق کی آگ
سینہ کاری	---	سینہ کھودنا
زمانہ کی طبیعت کا	---	عصر حاضر کا اقتضاء تقاضا
دل بستہ محل	---	محفل کا گرویدہ
تعصب	---	غیروں کو برا سمجھنا
سپند آسا	---	اسپند کے دانہ کی طرح
کف آئینہ پر حنا یا باندھنا	---	بے سود کام کرنا
سطر	---	مسطور یا احکام قرآن
چلیپا	---	صلیب
بت پندار	---	غرور کا بت

بوالہوس یاابوالہواس	---	ہوس کا باپ
فرقہ آرائی	----	مختلف گروہوں میں بٹ جانا
فریاض	----	روضہ کی جمع یعنی باغات
حباب	----	بلبلے کی ساخت
ساغرسرنگوں	----	اوندھا پیالہ
سراپانورہوجانا	----	مادی یاسفلی خواہشات سے بالاتر ہوجانا
بیتوں	---	ایران میں ایک پہاڑ کا نام

4.2:۴ ---خضرراہ

شاعر

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزاء ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب !
جیسے گہوارے میں سوجاتا ہے طفلِ شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب!
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب !
دیکھا گیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب !
دل میں یہ سنگر بپا ہنگامہ محشر ہوا
میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشم جہاں میں پردہ طوفان آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا مین سوتے ہیں خموش
''کشتی مسکین'' و'' جان پاک'' و'' دیوارچشم''
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا دوش
زندگی کا راز کیا ہے ؟ سلطنت کیا چیز ہے ؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش ؟
ہورہا ہے ایشیاء کا خرقہ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہین پیرایہ پوش !
گرچہ اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش !
بیچتا ہے ہاشمی ناموس دینِ مصطفیٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش !
آگ ہے ، اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے ؟
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

4.35 : خلاصہ

خضرراہ اقبال کی بہت مشہورنظم ہے۔یہ اقبال کی ملی شاعری کا بہترین شاہکار ہے اس نظم میں اقبال کا تصورخودی واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

4:36 : تشریح

نظم کی شکل مکالمے کی ہے جس میں وہ تمام زندگی اور قوم کی مختلف مسئلوں کے متعلق حضرت خضر علیہ السلام سے سوالات کرتے ہیں اور علیہ السلام اسکا جواب دیتے ہیں۔ظاہری اعتبار سے اس نظم میں خیالات کی ابتداء اوران کا ارتقاء خیال پر جوش اور ولولہ انگیز ہے پہلا بند شاعری کا بہت حسین مرقع ہے۔ بہت لطیف ونفیس انداز میں منظر کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ہر چیز صاف شفاف ہے یہاں پر اقبالؔ نے ایک ڈرامائی منظر نہایت کامیابی سے تحریر کیا ہے جس میں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی خضرس ءہم کلام ہیں۔

پہلے بند کے استعارے بہت حسین ہیں مگر نظم میں ہر جگہ خیالات وجذبات کے اظہار میں شعریت یکساں نہیں پھر بھی اقبالؔ کا پیام صرف مسلمانوں تک نہیں بلکہ اقبالؔ کی نظر سارے انسانی مسائل پر عادی ہے وہ دنیائے اسلام کی خاص کشتیوں کو سلجھانا چاہتے ہیں

اقبالؔ کی رگ رگ میں اسلامی جذبہ موجزن تھا۔ اقبال ایک حساس دل رکھتے تھے۔ جو کہ مسلمانوں کے تنزل ان کی غفلت لاپرواہی اور پوری قوم کے جمود کو دیکھ کر بے چین ہو گیا مگر وہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ کل انسانی دنیا کے یہ مسائل اس کے سامنے تھے وہ مغربی تہذیب کے طلسم کے تباہ کن اثر سے پوری طرح واقف تھے اور وہ قومی جمود کو توڑ کر بیدار کرنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مشرقی قوم کی فلاح اتحاد میں ہے۔ ربط وضبط میں ہے۔ ایشیاء والے بھی اس نکتہ سے بے خبر ہیں۔

اقبالؔ نے اپنی خضر راہ کو صحرا نوروی، زندگی سلطنت سرمایہ محنت اور دنیائے اسلام کے عنوانات میں بانٹا ہے ان کا ہر عنوان ایکدوسرے عنوان سے ربط وتسلسل میں ان کا سب سے بڑا مقصد دنیائے اسلام ہے جس میں وہ مسلمانوں کو تسبیح دانوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک کرانا چاہتے ہیں۔

4.37 : معلومات کی جانچ

۱۔ اقبالؔ کی نظم گوئی پر تنقید وتبصرہ کیجئے۔

۲۔ نظم خضر راہ کا خلاصہ پیش کیجئے۔

4.38 : نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ نظم ''خضر راہ'' پر نقد وتبصرہ کیجئے۔

۲۔ نظم ''خضر راہ'' پر تنقیدی نوٹ لکھئے۔

4:39 فرہنگ

محوِ نظر -- فطرت کا مطالعہ کرنا

سکوت افزا -- خاموشی بڑھانے والی ہوا، آسودہ ہوا ساکن تھی

نرم سیر -- آہستہ چلنے والا

آشیانون میں اسیر -- گھونسلوں میں سو رہے تھے

کم ضو -- جن کی روشنی بہت کم تھی

خضرؔ -- ایک بزرگ کا نام ہے جو بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں

جویائے راز --- وہ شخص جو خدا کے ارادوں یا نظام کائنات سے آگاہ ہونا چاہتا ہو

تقدیر عالم --- نظام کائنات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا

دریا --- مراد (کائنات)

کشتی مسکین --- مراد، غریب ملاحوں کی کشتی جس میں خضر نے سوراخ کر دیا تھا جان پاک سے وہ لڑکا مراد ہے جسے خضر نے قتل کر دیا تھا۔ دیوار یتیم سے ایک گاؤں کے یتیموں کی وہ دیوار ہے جو گرنے والی تھی۔ حضرت خضر نے اس کو درست کر دیا تھا۔

حیرت فروش --- حضرت موسیٰؑ پر بھی تیرے علم کی وسعت دیکھ کر حیرت طاری ہوگئی۔

اقوام نو --- دولت سے وہ اقوام مراد ہیں جو موجودہ زمانے میں برسرِ عروج آئی ہیں۔ مثلاً امریکہ، روس، انگلستان وغیرہ۔

پیرایہ پوش --- پیرو یا مقلد

فطرت اسکندری --- ملوکیت

4.40 : سفارش کردہ کتب

بانگ درا --- اقبالؔ

روح اقبالؔ --- ڈاکٹر یوسف حُسین خان

فکر اقبالؔ --- پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم

روح اسلام اقبالؔ کی نظر میں ---- پروفیسر غلام عمر خان

ذکر اقبالؔ ---- عبدالحمید سالک

اقبال بہ حیثیت شاعر ---- رفیع الدین ہاشمی

اقبالؔ معاصرین کی نظر میں ---- وقار عظیم

ارمغان ادب ---- امتیاز احمد، عطیہ رئیس

شعور و فن ---- ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

نئے تنقیدی زاویے ---- ڈاکٹر خوشحال زیدی

کلیات اقبالؔ ---- اُردو مکمل (علامہ اقبالؔ)

اقبالؔ اور مفکرین ---- جگن ناتھ آزاد

اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ---- جگن ناتھ آزاد